ڈاکٹر ذوالفقار علی دانش

ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبۂ اردو، گورنمنٹ پریمیئر ڈگری کالج، کراچی

سندھ کا سلسلۂ نقشبند اور سوانح نگاری
(محرکـــات، اســـلوب اور تجزیـــہ)

ABSTRACT

The Naqshband order of Sindh and its Biographies(Motives, Style and Analysis).

By Dr. Zulfiqar Ali Danish, Assoc. Prof., Department of Urdu, Govt. Premier Degree College, Karachi.

The biography is an important kind of monastrial literature. It can provide benefits to any period especially for emendation of a person. Naqshband patriarchs and follower of Sindh have also written many biographies. Biographies of Naqshbandies are guiding force for those who want to make themselves righteous man.

In the under discussion thesis, stimuli, style and analysis of discussing biographies are described. These biographies are written with reforming point of view. Mostly biographic books are written with research method but they lack modern research technics. The important quality of discussed biographies is that they are also suffice the aims and objects of monastic literature.

ہمارے موضوع کا تعلق صرف اُن سوانح عمریوں سے ہے جنھیں سندھ کے نقش بند سلسلے سے وابستہ افراد اور مشائخ نے قرطاس پر مرتسم کیا ہے۔ نقشبند سلسلہ دنیا کے کئی ممالک میں معرفتِ الٰہی اور اصلاحی و تربیتی تبلیغ میں مصروفِ عمل ہے۔ چار مشہور سلاسل قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ میں تین سلاسل کا تعلق حضرت علیؓ سے ہے جب کہ نقشبندیہ واحد سلسلہ ہے جس کا ربط حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ہے۔ ڈاکٹر مہربان حسین نے اپنے پی ایچ ڈی مقالے ''سلسلہ نقشبندیہ مجدّدیہ کے نامور صوفیائے کرام کی دینی و اصلاحی خدمات'' کے صفحہ نمبر ۵۹ پر لکھا ہے کہ سلسلہ نقشبندیہ کی ابتدائی کڑیاں حضرت ابوبکر صدیقؓ سے حضرت سلمان فارسیؓ پھر اِن سے حضرت بایزید بسطامیؒ سے ملتی ہیں۔ یہاں تک یہ سلسلہ ''صدیقیہ'' کہلاتا ہے۔ اِن اکابرین کے بعد خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ، شیخ ابی علی فارمدی طوسیؒ، خواجہ ابو یوسف ہمدانیؒ سے ہوکر عبدالخالق غجدوانیؒ تک کا سلسلہ

''طیفوریہ'' کہلاتا ہے۔ پھر عبدالخالق غجدوانیؒ سے نقشبندی سلسلے کے بانی خواجہ بہاء الدین نقشبندی تک کا سلسلہ ''خواجگانیہ'' کے نام سے منسوب ہُوا۔ ان کے بعد سے حضرت مجدد الف ثانیؒ تک کا سلسلہ ''نقشبندیہ'' کہلایا۔

سلسلہ نقشبندیہ کے بانی محمد بن محمد بہاء الدین البخاری (۷۱۷ھ/ ۱۳۱۷ء–۷۹۰ھ/ ۱۳۸۹ء) ہیں۔ ان کے بعد ہی ''نقشبندی'' کی اصطلاح معروف ومقبول ہوئی۔ آپؒ کی ولادت علوشان کی پیش گوئی خواجہ محمد بابا سماسیؒ نے فرمائی تھی۔ ولادت کے تین دن بعد جب بہاء لدین نقشبند کو خواجہ محمد بابا سماسیؒ کے پاس لے جایا گیا تو انھوں نے اپنی فرزندی میں لے لیا اور ان کی تربیت کا ذمہ حضرت امیر کلالؒ کو سونپا۔ حضرت خواجہ محمد بابا سماسیؒ حضرت عزیزانؒ کے خلفا میں سے تھے۔ جنھوں نے اپنے آخری وقت میں مریدین کو ان کی مطابعت کا فرمایا تھا۔ خواجہ محمد بابا سماسیؒ کا وصال ۷۵۵ھ میں ہوا۔ اِن کے خلیفہ حضرت امیر کلالؒ تھے۔ جن کا وصال ۷۷۲ھ میں ہوا۔ آپ کا مزار قصبہ خوسمار میں ہے۔ جنھوں نے سلسلہ نقشبند کے بانی حضرت بہالدین نقشبندی کی تربیت فرمائی۔ آپ کا وصال ۷۹۱ھ/ ۱۷۸۹ء کو ہُوا۔ آپؒ کا مزار قصر عارفان میں ہے۔ حضرت بہالدین نقشبندی کے بعد جن بزرگ نے برصغیر میں نقشبندیہ کو فروغ دیا۔ وہ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ ہیں۔ ان کے بعد یہ سلسلہ ''نقشبندیہ مجددیہ'' کہلایا۔

مجدد الف ثانیؒ کے دور سے نقشبندیہ سلسلے میں تبلیغ وتربیت کا اہم ذریعہ مکاتیب رہے ہیں۔ ان کے علاوہ بزرگانِ نقشبند کے پاکیزہ حالاتِ زندگی اور ان کے وظائف و اوراد کو ضبطِ قرطاس میں لاکر محفوظ کرنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ سندھ مے مشائخ نقشبند نے بھی اس روش کو برقرار رکھا۔ اسِ مقالے میں نقشبند سلسلے کے مشائخ اور ان سے وابستہ افراد کی تحریر کردہ سوانح کے محرکات، اسلوب اور افادیت کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ سوانحی کتب کے تحقیقی وتنقیدی تجزیے سے قبل سوانح نگاری کی تعریف اور اس کے فنی پہلوؤں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

سوانح عمری میں کسی فرد کے حالات و واقعات کو نثر میں پیش کیا جاتا ہے۔ یونس حسنی نے سوانح کی تعریف یوں بیان کی ہے کہ ''سوانح نگاری دراصل تاریخ کی وہ قسم ہے، جس میں قوموں اور نسلوں کے بجائے اشخاص اور ذاتیات سے بحث کی جاتی ہے۔ انسانی زندگی کے اُتار چڑھاو، خوبیوں کامیابیوں، گناہ وثواب کو محفوظ کیا جاتا ہے۔''(۱) اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ جب کسی فرد کے حالات اور واقعات کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو لازمی طور پر اس دور کے کچھ نہ کچھ سیاسی، سماجی اور معاشرتی ماحول کی عکاسی بھی ہوجاتی ہے۔ البتہ سوانح کا مقصد تاریخ کی ترجمانی کسی طور نہیں ہوتا۔ اسی لیے الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی کی سوانح عمریوں میں حالی کی فن سوانح نگاری کو شبلی کی تحریروں پر فوقیت حاصل ہے وجہ اس کی یہی ہے کہ شبلی کے ہاں تاریخی عنصر نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ ان کا اسلوب بھی عالمانہ رنگ لیے ہوئے ہے جب کہ سوانح نگاری میں اسلوب کی بھی اہمیت ہے۔ جس میں سادگی، روانی اور ادبیت کے عناصر لازمی ہیں۔ ''اصنافِ ادب اردو'' میں سوانح عمری کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے۔ ''سوانح میں عام طور طور زندگی کے کسی خاص شعبے سے تعلق رکھنے والی کسی مشہور اور ممتاز ہستی کے حالات زندگی اور کارناموں کی

روداد بیان کی جاتی ہے۔''[۲] مذکورہ تعریفات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب میں سوانح نگاری سے مراد وہ تحریر ہوتی ہے، جس میں کوئی شخص، کسی دوسرے فرد کے حالاتِ زندگی، اس کی سیرت اور اس کے کارناموں کو مفصّل قلم بند کرے۔ اگر کوئی فرد اپنے حالاتِ زندگی اور کردار کو خود قلم بند کرتا ہے تو وہ خودنوشت کہلاتی ہے۔ موضوع کے حوالے سے سوانح نگاری کی دو اقسام کی جاسکتی ہیں۔ ایک وہ جس میں صاحبِ سوانح، سوانح نگار کا ہم عصر ہو، دوسری وہ جس میں صاحبِ سوانح کا سوانح نگار سے قریبی تعلق ہو۔

سوانح نگاری کی ابتدا کیوں کر ہوئی؟ انسان کے جب پیارے دنیا سے پردہ فرما گئے ہوں گے تو اُن کی یادوں، کارناموں اور صفات کو زندہ اور محفوظ رکھنے کے لیے؛ اُن کے کوائف کو ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہوگا، اس کے علاوہ شخصیت کے حالاتِ زندگی کو قلم بند کرنے سے اُن کے اخلاق و صفات سے استفادہ بھی پیشِ نظر رہا ہوگا۔ ڈاکٹر یونس حسنی کے خیال میں آخری الذّکر پہلو ہی سوانح نگاری کا بنیادی محرک ہے۔ آسمانی کتب میں پیغمبروں اور بزرگوں کا تذکرہ بطور اصلاحِ عوام آیا ہے۔ انسان نے اِنھیں سے سوانح کا فن سیکھا ہے۔ اس لیے ابتدائی سوانح عمریوں کا مقصود افادی اور اصلاحی رہا۔[۳] اردو میں جو ابتدائی سوانح لکھی گئیں ہیں، اُن کا مقصد بھی اصلاحی تھا۔ مرورِ ایام کے ساتھ، اب سوانح نگاری ایک فن کی صورت اختیار کر گیا ہے، مگر آج بھی سوانح نگاری کا وہ طرزِ انداز زندہ ہے، جس کا مقصد اصلاحی و افادی ہے۔

سندھ کے خانقہی ادب میں مولانا سید زوّار حسین شاہؒ کی دینی، فقہی اور خانقاہی ادب میں خدمات قابلِ رشک ہیں، اِن کی خدمات کا سلسلہ، ان کے خلفا، مریدین اور خلفا کے مریدین نے بھی جاری رکھا ہُوا۔ سوانحی ادب میں آپ کی تین تصانیف حیاتِ سعیدیہ (۱۹۵۵ء)، حضرت مجدد الف ثانیؒ (۱۹۷۲ء، مقاماتِ فضلیہ (۱۹۷۳ء) اور انوارِ معصومیہ (۱۹۸۰ء) ہیں۔ ''حیات سعیدیہ'' سید زوّار حسین شاہ کی تحریر کردہ پہلی سوانح ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے شیخ خواجہ محمد سعید قریشیؒ کے حالات زندگی کو زیبِ قرطاس کیا ہے۔ خانقاہی ادب میں سوانح کے عمومی محرکات میں مرشد سے عقیدت و محبت اور اپنے شیخ یا اکابر کے حالاتِ زندگی کو محفوظ کرنا ہوتے ہیں۔ ''حیاتِ سعیدیہ'' کے مقصدِ تحریر کے بارے میں کچھ روشنی مصنف کے دیباچے سے بھی پڑتی ہے۔ آپؒ تحریر فرماتے ہیں: ''پھر پاکستان میں آباد ہونے پر کئی سال تک ہجرت کے اثرات، آبادکاری کی پریشانیوں اور کاغذ وطباعت کی پابندیوں کی وجہ سے اس خدمتِ جلیلہ کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی بالآخر حضرت مخدومنا ومکرمنا قبلہ عموی صاحب عزیز محمد قریشی صاحب گوہانوی مدظلہ العالی (برادرِ خورد [خرد] حضرت موصوف رحمۃ اللہ علیہ) وحضرت مولانا خواجہ محمد سعید گوہانوی مدلطفہ اور مخدوم زادگانِ عالی شان کی تحریک وتاکیدِ مکرر اس مقصد کی ترغیب وتائید کا باعث ہوئی۔''[۴]

دیباچے میں مزید فرماتے ہیں کہ ''غرض اس تالیف کی یہ ہے کہ ان حالات سے سبق حاصل کیا جائے اور صاحبِ سوانح کی تقلید میں سنتِ نبویؐ پر حتی الامکان پوری طرح عمل کر کے فلاحِ دارین کا وسیلہ بنایا جائے۔''[۵] خانقاہی ادب کا اہم ترین مقصد لوگوں کی اصلاح ہوتا ہے، بزرگوں کی سوانح حالات کا مطالعہ اصلاح اور بقول صاحب زادہ ابوالخیر کے صحبتِ باطنی اور معنوی

کے زمرے میں آتا ہے۔(۶)

گرچہ ''حیاتِ سعیدیہ'' آپؒ کی پہلی سوانح ہے مگر اس کے دیباچے میں سوانح کے بارے اہم تنقیدی نکتے بیان کیے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ بزرگوں کے حالاتِ زندگی کو اُن کی زندگی ہی میں تحریر کیا جائے تا کہ حالات افراط وتفریط سے محفوظ ہوسکیں۔(۷) راقم اس خیال سے اس لیے متفق ہے کہ خانقاہی ادب میں سوانح نگاری میں عقیدتی رنگ کا غلبہ نظر آتا ہے۔ شاید اسی لیے زوّار حسین شاہؒ نے زندگی میں بزرگوں کے حالات رقم کرنے کے بارے میں تحریر فرمایا۔اسی طرح سوانح نگاری سے متعلق اس حقیقت کو بھی افشا کیا کہ ''کسی کے سوانح حیات میں تمام عمر کے حالات کو احاطہ کر کے تحریر میں لانا ہو [ہواضافی] سخت دشوار امر ہے کہ اوّل تو وہ تمام حالات کسی کو [کے] محفوظ نہیں رہتے اور پھر اس قدر زمانہ گزرنے کے بعد اگر ان کو سوچ کر لکھا بھی جائے تو غلطی کا احتمال قوی مانعِ تحریر ہوجاتا ہے۔''(۸) مذکورہ بیان ان کی حقیقت پسند طبیعت کی غمازی کر رہا ہے۔

دیباچے کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس کے ذریعے مصنف کی عاجزی اور انکساری کا بھی پتا چلتا ہے۔سوانح نگار نے جو لوازمہ بیان کیا ہے یقیناً ان میں ان کی کاوشوں اور تحقیقی احتیاط کا اندازہ ہوتا ہے مگر آپؒ اس لوازمے کا اعزاز خود نہیں لیے بلکہ اسے کا سہرا اپنے پیر بھائیوں، مخدومین اور مخدوم زادگان کے سر باندھ دیتے ہیں جب کہ اپنے بارے میں نہایت ہی انکسارانہ جملے تحریر فرماتے ہیں۔ خانقاہی ادب سے وابستہ حقیقی افراد میں یہ عاجزی اور انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہوتی ہے۔سوانح نگار تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''اور ان حضرات کے ارشاد کی تعمیل سے انکار کو سوءِ ادب سمجھ کر اس عاجز نے اپنی بے بضاعتی اور کم علمی کے باوجود اِن حضرات اور دیگر احبابِ سلسلہ کے مہیا کیے ہوئے مضامین اور بعض ناقص معلومات کو ترتیب وتالیف میں لانے کی سعی کی تا کہ مالا یدرک کلہٗ لا یترک کلہ..... تاہم زیادہ تر حصہ حضرت مولانا محمد سعید صاحب گوہانوی مدظلہ العالی نے مہیا فرمایا ہے جس کا ان کو حق بھی پہنچتا ہے۔ بہر حال جو کچھ بن پڑا معذرت کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں پیشِ خدمت ہے..... اور ساتھ ہی یہ بھی استدعا کہ چوں کہ اس میں روایات بالمعنی ہیں یعنی وہی الفاظ و کیفیات لفظ بہ لفظ تو کس کو یاد رہی ہیں البتہ یادداشت کو اپنے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ اس لیے..... تحریری و تالیفی خامیوں پر خاکسار مؤلف کی کم علمی کے پیشِ نظر مسامحت وچشم پوشی سے کام لیں اور دعائے مغفرت سے یاد فرمائیں۔''(۹)

''حیاتِ سعیدیہ'' میں جہاں سوانح نگار نے اپنے مشاہدات کو قلم بند کیا ہے، وہیں آپؒ کے بڑے صاحب زادے

مولانا محمد صادق کی یادداشت و بیانات اور دیگر خلفا کی آرا، مکتوبات اور شواہد سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اِس سوانح عمری کا انداز دیگر سوانح عمریوں میں بھی نظر آتا ہے۔ جس کی تفصیل اِن کی دیگر کتب کے ضمن میں بیان کی گئی ہے۔ اس سوانح میں ۱۶۴ ذیلی عنوانات قائم کر کے ممدوح کے حالاتِ زندگی اور سیرت کے عملی پہلوؤں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس تفصیل میں حضرت زوّار حسین شاہؒ کی تحقیقی احتیاط بھی دکھائی دیتی ہے۔ ممدوح کے سلسلہ نسب میں جب حضرت بہاء الحق والدین خواجہ بہاءالحق زکریا ملتانی قدس سرہ العزیز کا ذکر فرمایا تو ان کے بارے میں مفصل حاشیہ تحریر کیا۔[۱۰] اسی طرح خواجہ محمد سعیدؒ کی تاریخ بیعت میں حاشیہ دینا، ایک حقیقت پسندانہ اور غیر جانب دارانہ رویّہ ہے۔ جس کی خانقاہی ادب میں مثال شاذ ہی نظر آئے گی۔ خواجہ محمد سعیدؒ کے اپنے ہاتھوں کی لکھی ہوئی تاریخ بیعت میں اوّل شک کرنا، بعد ازاں مکمل درست نہ ہونے پر اس کی تصحیح کرنا۔ تربیتِ مریدین کے ضمن میں جو ملفوظات بیان کیے ہیں۔ ان کے راوی کا نام (مولانا گوہانوی) بھی درج کر دیا ہے۔ (ص ۱۲۴ نیا)۔ کچھ مواقع پر جہاں عبارت میں ایسا پہلو ہے جو قرآن و حدیث سے واضح نہ ہو، بلکہ کیفیات کے نتائج پر مبنی ہوں، اُن کے ساتھ ''واللہ اعلم باصواب'' کے الفاظ رقم کر دیے ہیں۔ یہ پہلو اِن کی تحقیق سے محبت اور احتیاط کی غمازی کا ثبوت ہیں۔

سید زوّار حسین شاہؒ کا تنقیدی شعور بھی ''حیاتِ سعیدیہ'' میں نظر آتا ہے۔ ''چند ناصحانہ حکایات'' کے عنوان سے جو حکایت قلم بند کی گئیں ہیں۔ ان کے نتائج کو آپؒ نے قرآن اور احادیث کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح کتاب کی جو فہرست ترتیب دی گئی ہے۔ اس میں بھی تنقیدی رجحان نمایاں ہے۔ کتاب میں اوّلاً اسم شریف، بعد ازاں تعلیم و تربیت، ذریعہ معاش، حالات اور قبل از بیعت کا ذکر کیا گیا ہے۔ بعد ازاں آپؒ نے جس طرح زندگی بسر فرمائی۔ اُن میں شیخ کی محبت، مریدیں کی تربیت اور تبلیغی اسفار کے بارے میں جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ بالخصوص تربیت اور اصلاح کے لیے آپؒ نے دل چسپ، سبق آموز اور پُر اثر حکایت اور ملفوظات بیان کیے ہیں۔ تربیت اور اصلاح خانقاہی ادب کی سوانحوں کی اہم صفات ہیں۔ اسی طرح اولادِ امجاد اور خلفا کے نام بھی کتاب کی زینت بنے ہیں۔ آخر میں اپنی دو اردو نظمیں اور مختلف عقیدت مندوں لے کہے ہوئے قطعاتِ تاریخ وصال پیش کیے ہیں۔ منظوم سلسلۂ نقشبند شجرہ آخر میں دیا گیا ہے۔

''حیات سعیدیہ'' کا اسلوب عام فہم ہونے کے ساتھ ادبیت کا حامل بھی ہے۔ کئی مقام پر فارسی اور اردو اشعار رقم کیے ہیں۔ جملوں میں اختصار اور ابہام سے پاک معنویت ہے۔ الفاظ کے چناؤ میں عام فہمی کو پیشِ نظر رکھا گیا۔ قرآنی آیات اور احادیث کو مع ترجمے کے مناسب مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ البتہ عبارت میں رموز و اوقاف کئی مقامات پر درج نہیں کیے گئے ہیں۔ لیکن عبارت میں سادگی اور جملوں میں اختصار کے سبب مفہوم میں اِشکال پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اسلوب کی جھلک دیکھیے:

''تقریباً تہائی رات باقی رہے تہجد کے لیے اٹھ جاتے تھے استنجا وغیرہ سے فارغ

ہونے پر وضو مسواک کے ساتھ کر کے نمازِ تہجد عام طور پر جائے قیام پر ہی پڑھتے تھے جو تحیۃ الوضو کے علاوہ اکثر آٹھ رکعت پڑھتے کبھی دس یا بارہ رکعت بھی پڑھ لیتے تھے اور کبھی وقت کم ہو تو کم بھی۔ حتی الامکان بیماری وسفر وحضر میں بھی تہجد نہیں چھوڑتے تھے۔ تہجد کے بعد دعا مانگتے اور اس دعا میں جماعت کے لوگوں لیے خاص طور پر دعا مانگتے تھے پھر مراقب ہوجاتے اور فجر کی سنتوں سے پہلے تک مراقب رہتے۔ فجر کی سنتیں مکان پر ہی ایسے وقت پڑھ لیتے کہ جس کے بعد اطمینان کے ساتھ مسجد میں جماعت شروع ہونے سے پہلے پہنچ جائیں۔''(۱۱)

الغرض ''حیاتِ سعیدیہ'' سید زوّار حسین شاہؒ کی پہلی سوانح ہونے کے باوجود موضوعات، محرکات اور اسلوبِ بیان کے اعتبار سے ایک بھرپور سوانح ہے۔ جس میں سوانح نگاری کا فنی پہلوؤں کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۵ء اور دوسرا ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء میں شائع ہوا، جو ہمارے پیشِ نظر ہے۔ جس کا دیباچہ ۱۳۹۰ھ کا تحریر کردہ ہے۔ کتاب ۲۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعودؒ کی تصنیف ''حضرت شاہ محمد غوث گوالیاریؒ'' خانقاہی سوانحی ادب میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جو مؤقّر رسالے ''معارف'' اعظم گڑھ میں پانچ اقساط (جولائی، اگست، ستمبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۶۲ء) میں شائع ہُوا۔ اس مقالے میں مستشرقین کی تحقیقی سہو کی تصحیح بھی کی گئی ہے۔ تھامس ولیم بیل (T.W. Beale) نے لکھا تھا کہ آپ کا سلسلہ ساتویں پشت میں خواجہ فرید الدین عطّار سے ملتا ہے۔ جب کہ سوانح نگار کی تحقیق کے مطابق یہ سلسلہ چھٹی پشت میں ملتا ہے، جو شاہ محمد غوثؒ کی اپنی تصنیف ''جواہر خمسہ'' میں درج ہے۔ اسی طرح اس نے شاہ محمد غوث گوالیارؒ کے دادا کا نام معین الدین قتّال لکھا، جب کہ یہ نام آپ کے پردادا کا ہے۔(۱۲) اور اُس نے آپ کی جنگل میں ریاضت ۱۲ سال لکھی جو ۱۳ سال چند ماہ ہے۔(۱۳) یہی نہیں ڈاکٹر محمد مسعودؒ نے ماضی میں بیان کردہ دیگر افراد کی بھی کئی معلومات درست کی ہیں۔ اِس مقالے کی تیّاری کے لیے سندھ یونی ورسٹی لائبریری حیدرآباد، پروونشل لائبریری حیدرآباد، سنٹرل لائبریری بھاول پور، پنجاب یونی ورسٹی لائبریری لاہور، پشاور یونی ورسٹی پشاور، اسلامیہ کالج لائبریری پشاور اور انڈیا آفس لائبریری لندن سے استفادہ کیا گیا ہے۔

زیرِ بحث کتاب میں موجود اُس بیان سے آپ کی تحقیقی دیانت داری کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس میں ڈاکٹر صاحب، غوث محمد گوالیارؒ کی سیادت کے بارے تحقیق نہیں کر سکے تھے۔ لہٰذا اس کا اعتراف کر لیا۔(۱۴) آپ کے درج ذیل بیان سے بھی آپ کے معیارِ تحقیق کا پتا چلتا ہے:

''بعض مسامحات سے قطع نظر یہ کتاب چوں کہ خالص علمی وتحقیقی تھی، اس لیے اہلِ علم

تحقیق میں زیادہ مقبول ہوئی۔ جرمنی کی فاضلہ پروفیسر ڈاکٹر این میری شمل نے بھی اس سے استفادہ کیا، یورپ اور امریکا کی لائبریریوں میں بھی رکھی گئی، لیکن پذیرائی کے ساتھ ساتھ یہ تحقیق بعض خانقاہ نشینوں اور ان کے متنبین کو گراں معلوم ہوئی اور وہ خفا ہو گئے، جس کا وہم وگماں بھی نہ تھا، کیوں کہ تحقیق کا مقصد کسی کو خوش کرنا یا ناراض کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصدِ وحید حالات و واقعات کو دلائل و شواہد کی روشنی میں غیر جانب دارانہ پیش کرنا ہوتا ہے۔''(۱۵)

آپ نے خانقاہوں کے اہل علم اور محقق و دانش وروں کی تعصّب و تنگ نظری کا شکوہ بھی کیا ہے جو علمی کاوشوں کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور دھمکی آمیز اور دہشت گردانہ رویہ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ جب کہ آپ کا خیال ہے ''علم ودانش میں تعصّب نظری کی کوئی گنجائش نہیں۔''(۱۶)

اس کتاب کے محرکات میں اوّل تو اپنے اکابرین کے کارناموں کو عوام الناس تک پہنچانا ہے جو اُن کے لیے راہ نمائی کا سبب بنتے ہیں، اس پہلو کا اظہار ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاںؒ نے ''سر نامہ'' میں تحریر کیا ہے۔(ص۸) دوسرا محرّک جو بزرگان کے سوانح قلم بند کرنے کا یہ رہا ہے کہ اُن کے حالاتِ زندگی کے مطالعے سے لوگوں کے قلوب مسخّر اور توانا ہوجاتے ہیں، جس کا ذکر ڈاکٹر محمد مسعودؒ نے طبع اوّل کے ''سرِ آغاز'' میں کیا ہے۔(ص۱۰) طبع ثانی کی تقدیم میں تحریر فرماتے ہیں: ''اولیا اللہ کے ذکر اذکار اللہ تعالٰی کے لشکروں میں سے ایک عظیم لشکر ہے۔ اِن سے روح کو غذا ملتی ہے اور دل کو قوّت میسّر آتی ہے۔ خود مولیٰ تعالٰی نے اپنے محبوبوں کا اس لیے ذکر فرمایا تا کہ دل مضبوط ہوں اور ہمّت بلند رہے۔''(۱۷) اس مقالے کو کتابی صورت دینے میں خاندانِ غوثیہ کے چشم و چراغ سید محمد خطیر الدین شاہ کا بھی ایک اہم کردار ہے، جنھوں نے اس مقالے کا مطالعہ کرنے کے بعد ڈاکٹر محمد مسعود احمدؒ سے اِسے کتابی صورت دینے کی مسلسل فرمائشیں کیں، یہی نہیں بلکہ کتاب کی طباعت کے بارِ گراں کو اپنے ذمے لیا۔

اس کتاب کا طبع اوّل میں شائع ہونے والا ''سرِ آغاز'' بھی انتہائی معلوماتی ہے، جس میں مختلف ممالک سے ہندوستان آنے والے اولین مشائخ اور سلاسل کو فروغ اور ترویج دینے والوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، جس سے سلاسل کے خاص اکابرین کے بارے میں واقفیت ہوتی ہے۔

یہ کتاب چار حِصَص اور ایک ضمیمے پر مشتمل ہے۔ حصہ اوّل حالاتِ زندگی، حصّہ دوم اولاد امجاد، حصّہ سوُّم تصانیف اور حصّہ چہارم خلفاے کبار، یہ تمام حصّے مختلف ذیلی عنوانات میں مُنقسَم ہیں۔ یہ ذیلی سرخیاں جہاں حضرت شاہ محمد غوث گوالیارؒ کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرتی ہیں، وہیں اُن کی شخصیت اور افکار کی تفہیم میں بھی معاون ثابت ہوتی ہیں۔ کتاب کو جدید تحقیقی انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ ہر حصّے کے آخر میں حوالے دیے گئے ہیں جو مفصل ہیں۔ آخر میں کتابیات بھی دی گئی

ہے۔ چند صفحات میں مصنف کی کتب، موضوع، مقامِ اشاعت اور سَنِ اشاعت دیا گیا ہے۔

آپ کا اسلوب پُر تاثیر ہے کیوں کہ آپ نے مختصر لفظوں میں اِس طرح اظہارِ خیال کیا ہے کہ بات واضح اور عام فہم رہی ہے۔ عام فہمی کے ساتھ ادبیت کا پہلو بھی برقرار رہا۔ دوسروں کی آرا میں اگر اندازِ بیاں مبہم یا واضح نہ ہو تو آپ نے اُسے اپنے اسلوب بیان کے ذریعے پیش کیا ہے یا اُس کی وضاحت کی ہے۔ طویل اقتباس سے گریز کیا گیا ہے، جہاں فارسی اقتباسات دیے ہیں، وہاں عموماً اُن کا ترجمہ بھی دیا ہے۔ مبہم اقتباس کی مثال ملاحظہ کریں:

> ''آپ شیخ ظہورالدین حاجی حصور کے شاگرد تھے، سلسلہ شطاریہ سے آپ کا تعلق تھا، آپ اور آپ آٹھ بھائی شیخ حاجی حمید کے مرید تھے۔''(۱۸)

اس عبارت کی یوں وضاحت کی کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ظہور الدین حصور اور شیخ حاجی حمید دو علاحدہ شخصیات ہیں، جب کہ یہ دونوں ایک ہی شخصیت ہیں۔ حالات زندگی جو سوانح حیات کا بنیادی جزو ہے۔ اس میں تمام مآخذات کا تذکرہ کر کے دلیل و برہان کے ذریعے صداقت پر پہنچنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ یہی انداز دیگر معلومات میں بھی رہا ہے جو خانقاہوں سے وابستہ اور دیگر مذہبی افراد کے لیے مشعل راہ ہے۔ اسلوب کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

> ''شاہ محمد غوث، ''غوثِ وقت'' تھے اور شاہانِ ہند ان کو ''غوث الثّقلین'' کے خطاب سے یاد کیا کرتے تھے۔ ان شواہد کی روشنی میں کوئی وجہ نہیں کہ شاہ محمد غوث کی عدم غوثیت پر اصرار کیا جائے، اگر لفظ ''غوث'' کو شیخ طریقت کی طرف سے خطاب بھی تسلیم کر لیں تو اس سے غوثیت کی نفی نہیں ہوتی بلکہ تصدیق ہوتی ہے، کیوں کہ خطاب مرشد کی طرف سے ہے، مرید کے روحانی کمالات کا، اُس سے زیادہ کس کو علم ہوسکتا ہے۔''(۱۹)

میر پورخاص شہر سے ۱۹۶۴ء میں یہ کتاب شائع ہوئی جو راقم کی جنم بھومی ہے اور شاہ عبداللّطیف کالج میر پورخاص کے شعبۂ اردو میں یہ تحریر کی گئی اُس میں بھی راقم نے تدریسی فرائض انجام دیے ہیں۔ جب کہ دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۸ء/ ۱۴۱۸ھ میں ادارۂ مسعودیہ کراچی نے شائع کیا۔

سوانح نگاری خانقاہی ادب کی ایک اہم اور معروف صنف ہے۔ اس لیے اس ادب میں سوانح کے مختلف معیارات نظر آتے ہیں۔ اس صنف میں سید زوّار حسین شاہؒ نے ایک خاص تحقیقی انداز عطا کر کے خانقاہوں سے وابستہ افراد کو ایک نئی راہ سجھائی۔ ''حضرت مجدّد الف ثانیؒ'' اس کی ایک بہت اچّھی مثال ہے، جس میں سوانح نگار نے صاحب سوانح کے اس قدر تفصیل سے حالاتِ زندگی اور ان سے متعلق دیگر معلومات فراہم کی ہیں، جس سے استفادے کیے بغیر مجدد الف ثانیؒ کی سیرت پر کوئی اچھی کتاب لکھی جاسکے۔ اس کتاب میں صرف مجدّد الف ثانی احمد سرہندیؒ کے کوائف ہی نہیں بیان کیے ہیں بلکہ آپؒ کے

سلسلۂ نسب کے تمام افراد یعنی حضرت عمر فاروقؓ سے لے کر آپؒ کے والد محترم مخدوم عبدالاحدؒ تک کے اہم اور مختصر حالاتِ زندگی کو پیش کیا ہے، تاکہ آپؒ کی خاندانی عظمت و وجاہت کا بھی اندازہ ہو سکے۔

زیرِ بحث کتاب؛ مجدد الف ثانیؒ کی زندگی پر ایک مفصّل اور جامع کتاب ہے۔اس تصنیف کی اہم خاصیت یہ ہے کہ اِسے مستند کتب کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے،اُن میں سے کچھ اہم یہ ہے۔خواجہ محمد ہاشمؒ (خلیفہ،مجدد الف ثانیؒ) ''برکاتِ احمدیہ'' تاریخی نام ''زہد المقامات''، مولانا بدرالدین سرہندیؒ (خلیفہ مجدد الف ثانی) کی ''حضرات القدس'' (دوجلدیں)،مجدد الف ثانیؒ کی اولادِ امجاد میں سے پانچویں پشت میں خواجہ ابوالفیض کمال الدین کی ''روضۃ القیومیہ''۔جب کہ کتاب کے آخر میں دیگر کتب کے نام کتابیات میں درج کر دیے گئے ہیں،جن کی تعداد اکاسی (۸۱) ہے۔

زوّار حسین شاہؒ نے کتب کو جن فصلوں میں تقسیم کیا ہے،ان میں سے کچھ یہ ہیں۔سلسلہ نسب،سلسلہ طریقت،حیاتِ مبارکہ،حلیہ،معمولات،کشف وکرامات،ملفوظات،دعوت کا پس منظر،تجدیدی کارنامے،تعلیمات،تصانیف،اولاد،خلفا اور مکتوب الیہم۔پھر ان کی ذیلی سرخیوں کے تحت معلومات فراہم کی گئی ہیں۔سلسلہ نسب سے متعلق چند ذیلی سرخیوں سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ سوانح نگار نے کس قدر باریک بینی سے اہم اور بنیادی معلومات فراہم کی ہیں۔یہ اسلوب دیگر فصلوں میں بھی برتا گیا ہے۔سلسلہ نسب میں اوّل اسم گرامی،نسب مبارک، نسب سے متعلق نقشہ،اجداد کے مختصر حالاتِ زندگی،سرہند شریف کی خصوصیات و برکات،والد محترم مخدوم عبدالاحدؒ کی شادی،اولاد امجد،سجادہ نشینی اور ان کی وفات شامل ہیں۔اس سوانح کی چند خصوصیات جس کا تذکرہ مصنف نے مقدمے میں کیا ہے،وہ یہ ہیں؛ نسب کے بارے میں تحقیق وتفصیل سے تحریر کیا گیا ہے۔ دعوتِ دین کا پس منظر مفصّل ہے۔مخالفین کے اعتراضات کے جوابات دیے گئے ہیں۔تعلیمات کو مکتوبات سے اخذ کیا گیا ہے اور ان کا ترجمہ سلیس اردو زبان میں دیا گیا ہے،اس کے ساتھ مکتوبات کا ایک انڈکس بھی دیا ہے۔

اس سوانح کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس میں سلسلہ نقشبندیہ کے تمام اکابرین کے مختصر حالاتِ زندگی کو بھی کتاب کی زینت بنا دیا گیا ہے۔حضور اکرم ﷺ سے خواجہ باقی باللہؒ تک کے بارے میں بنیادی اور خاص باتیں زیرِ بحث سوانح سے مل جاتی ہیں۔یہی نہیں ''حضرت مجدد الف ثانیؒ'' میں مختلف اولیا کرام کا ذکر بھی ہے۔اُن کی بھی ایک فہرست ہے۔ جس میں ابراہیم بن ادھمؒ،شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، بوعلی شاہ قلندرؒ،مخدوم جلال الدین بخاری وغیرہ جیسے اولیا کرامؒ شامل ہیں۔ان کے علاوہ اکبر بادشاہ، جہانگیر، عالم گیر اور سلطان محمود غزنوی جیسے بادشاہوں کا تذکرہ بھی ہے۔ضمنی تذکرے کے نام سے ان کی بھی فہرست مع صفحات نمبر،فہرستوں کے آخر میں دی گئی ہے۔

پیش کش بہت ہی معقول ہے۔اس میں قاری کے استفادے کے لیے حتّی الامکان سہولتیں بہم پہنچائیں گئی ہیں، اس افادیت کا سلسلہ فہرست ہی سے شروع ہوجاتا ہے،پہلی ''مجمل فہرستِ مضامین'' ہے۔جس میں فصلِ عنوان کے سامنے اُن

کی تعدادِ صفحات، آغازِ صفحہ نمبر اور اختتامِ صفحہ نمبر دیا گیا ہے۔ یوں قاری یا محقق صاحبِ سوانح کے جس پہلو کا مطالعہ کرنے کا خواہش مند ہے۔ فوراً اُس تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ کیوں کہ ہر فصل کی ذیلی سرخیاں بھی ہیں۔ اس لیے اس طریقے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا یہ انداز دیگر محققین کے لیے بھی مفید ہے۔ مصنف کا نقطۂ نظر اور ترجیحات کا اندازہ بھی اس فہرست سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ سوانح نگار نے مختلف پہلوؤں کے لیے کس قدر صفحات مختص کیے ہیں۔ اِس میں سب سے زیادہ یعنی ۱۸۹ صفحات مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ زوّار حسین شاہؒ کی نظر میں آپ کی تعلیمات کو عام کرنا اہم مقصد تھا۔

کتاب کے محرّکات کا ذکر زوّار حسین شاہؒ نے مقدمے میں تفصیل سے کیا ہے۔ انھوں نے پہلے قرآن و حدیث کی روشنی میں صالح صحبت کے احکام بیان کیے ہیں، پھر فرمایا ہے کہ:

> ''اگر کسی شخص کو اہل اللہ کی صحبت میسّر نہ ہو تو اس کو چاہیے کہ کم از کم ان کے ملفوظات و تحریرات کا بہ نظرِ اصلاح و استفادہ مسلسل مطالعہ کرتا رہے کہ اس سے بھی اہل اللہ کا ایمان و عمل ہمارے اندر منتقل ہو جاتا ہے اور قالب سے گزر کر کے قلب و روح میں اُتر جاتا ہے، چوں کہ اس زمانے میں صلحا و علماے ربّانی کمیاب ہیں اور ہر جگہ اچھی صحبتیں میسر نہیں ہیں، اس لیے مذہبی کتابوں کا مطالعہ اچھی صحبتوں کا بدل ہیں اور وہ کتابیں جو بزرگوں کے حالات، نصائح اور دین داری کا جذبہ پیدا کرنے والے مضامین پر مشتمل ہوں، یقیناً نیک صحبتوں کے قائم مقام ہیں۔''(۲۰)

سید زوّار حسین شاہؒ نے مجدد الف ثانیؒ کی اصلاحی و تبلیغی خدمات کو ضبطِ تحریر میں کر کے، ان کی تعلیمات اور فیض کے نتیجے میں برصغیر میں جو دینی ہستیاں تیّار ہوئیں، ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''یقیناً ایسی عظیم المرتبت شخصیت کا تذکرہ نیک لوگوں کی صحبت کا بہت عمدہ بدل اور عوام و خواص کے لیے نافع ترین و حصولِ برکت کے لیے عظیم ترین ہوگا۔''(۲۱) ''حضرت مجدد الف ثانیؒ'' تحریر کرنے کے پس منظر میں مذکور ہر پہلو بھی پیشِ نظر رہا۔

کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اُن موضوعات سے لگایا جاسکتا ہے، جو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی شخصیت اور سیرت کے حوالے سے قائم کیے گئے ہیں۔ ان میں ممدوح کا سلسلۂ نسب، سلسلہ طریقت، حیاتِ مبارکہ، حلیہ، معمولات، کشف و کرامات، ملفوظات، دعوت و تجدید کا پس منظر، تجدیدی کارنامے، تعلیمات، تصانیف، اولادِ امجاد، خلفا عظام، مکتوب الیہم، آپؒ کی مجددیت وغیرہ کو تفصیلی اور تحقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ اِن عنوانات سے معلوم ہوتا ہے کہ سوانح نگار نے کس قدر تحقیق اور محنت شاقّہ کے بعد اس کتاب کو مرتّب کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اردو میں سوانح نگاری پر جو پی ایچ۔ ڈی۔ کے مقالے شائع ہوئے ہیں، اُن میں خانقاہی ادب کی سوانحی کتب کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ ان مقالوں میں ڈاکٹر حسن گل وقار

کا ''سوانح نگاری آزادی کے بعد'' اور ڈاکٹر ممتاز فاخرہ کا ''اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا'' شامل ہیں۔

سید زوّار حسین شاہؒ کا اندازِ تحریر خانقاہی مزاج سے ہم آہنگ اور مطابقت رکھتا ہے۔آسان اور سادہ زبان استعمال کرتے ہیں۔جملوں میں اس قدر باہمیربط ہوتا ہے کہ تحریر میں روانی پیدا ہوجاتی ہے۔بعض مقامات پر الفاظ کا چناو ایسا ہے، جس میں ہم وزنی اور ہم قافیائی ہے۔جس سے نثر کا ادبی رنگ مزید نکھر جاتا ہے۔مکتوبات شریف کے اقتباسات کو آسان انداز میں اردو ترجمہ کیا ہے تاکہ اردو قارئین تفہیم کرسکیں۔حسبِ محل اشعار کے استعمال سے بھی نثر کے حسن میں دوچند اضافہ ہوا ہے۔اس کی مثال ذیل میں دیے گئے اقتباسات سے لگائی جاسکتی ہے۔جن سے سوانح نگار کے اسلوب سے واقفیت ہوتی ہے:

''اسمِ گرامی: اسلام کے اس درویش باصفا مصلح اعظم کا نامِ نامی و اسم گرامی احمد، لقب بدرالدین، کنیت ابوالبرکات، منصب خزینۃ الرحمۃ، قیوم زماں، مجدّد الف ثانی اور عرف عام میں امام ربانی، محبوب صمدانی تھا۔آپ کا مذہب حنفی اور مسلک نقشبندیہ طریقہ تھا جو تمام سلاسلِ تصوّف کا جامع ہے۔

نسبِ مبارک: آپ کی رگوں میں اس مشہور فاتح کا خون تھا۔جس نے مختصر سی فوج اور بے سرو سامانی کے باوجود ظالم اور جابر بادشاہوں کو سرنگوں کردیا تھا اور زورِ بازو ،قوّت اور تدبّر سے عظیم ترین سلطنتوں کے تختے اُلٹ دیے تھے اور اپنی روحانی قوّتوں سے مستحکم تہذیبوں کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔

نسب تحریر کیا ہو، اس شہِ گردوں مقامی کا
شرف خورشید پاسکتا نہیں جس کی غلامی کا
شہنشاہوں کے دل ہیبت سے جس کی ہوگئے پانی
وہی فاروقِ اعظم نام ہے جدِّ گرامی کا''(۲۲)

'' آں حضرت ﷺ ظہور میں تمام مخلوقات سے افضل واکمل، مرتبہ میں سب سے زیادہ قریب اور کمال میں سب سے زیادہ جامع اور جمال میں سب سے زیادہ کامل اور حسن میں سب سے زیادہ اکمل، قدر میں سب سے زیادہ بلند، بزرگی و شان میں سب سے زیادہ عظیم، دین میں سب سے زیادہ مضبوط، ملّت میں سب سے زیادہ راست، حسب میں سب سے زیادہ کریم و بزرگ، نسب میں سب سے زیادہ شریف اور خاندان میں سب سے زیادہ معزز ہیں۔اگر اللہ تعالیٰ کو ان کا پیدا کرنا منظور نہ ہوتا تو خلقت کو پیدا نہ کرتا اور نہ ہی اپنی ربوبیت کو ظاہر فرماتا۔''(۲۳)

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۲ء میں اور تیسرا ایڈیشن جو ہمارے پیش نظر ہے۔ ۱۹۸۳ء/ ۱۴۰۳ھ میں ادارہ مجددیہ کراچی نے شائع کیا۔

اردو کے خانقاہی ادب میں بحیثیت سوانح نگار سید زوّار حسین شاہؒ کا اہم مقام ہے، آپ کے فن سوانح نگاری کے بارے میں مولانا سید محبوب حسن واسطی لکھتے ہیں کہ ''حضرت شاہ صاحبؒ کے مزاج میں بڑا اعتدال تھا۔ آپؒ کی سوانح نگاری کی ایک بڑی خصوصیت ایسی حقیقت پسندی اور اعتدال ہے، جس میں نہ افراط ہے نہ تفریط، بلکہ تاریخ کی روشنی میں واقعات کا صحیح تجزیہ، آپ کا مقصودِ اولین ہے۔ آپ کی سوانح نگاری کی دوسری بڑی خصوصیت آپ کی انتہائی کوشش وکاوش ہے کہ اس مقدس ہستی کی سیرت کا کوئی بھی پہلو جس پر روشنی ڈالی جاسکتی ہے، تشنۂ تکمیل نہ رہ جائے۔''(۲۴) مذکورہ خاصیتوں کے علاوہ سید زوّار حسین شاہؒ کی سوانح نگاری کی صفات میں تحقیقی انداز اور مفصّل حالاتِ زندگی بیان کرنا بھی شامل ہیں۔

سید زوّار حسین شاہؒ کی کتاب ''مقامات فضلیہ'' اُن کے دادا مرشد خواجہ فضل علی قریشیؒ کی سوانح حیات ہے۔ خانقاہی نظام میں دادا مرشد کی اہمیت اس لیے دیگر کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے کہ وہ مرشد (محبوب) کا بھی مرشد (محبوب) ہوتا ہے۔ اس لیے ان سے بھی عقیدت کا گہرا رشتہ قائم ہوجاتا ہے۔ مذکورہ سوانح تحریر کرنے کا ایک محرّک یہ پہلو بھی ہے۔ اس سے قبل ممدوح خواجہ فضل علی قریشی کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ایک کتاب ''حیاتِ فضلیہ وملفوظاتِ قریشیہ'' کے نام سے مولانا محمد مسلمؒ نے ترتیب دی تھی۔(۲۵) مگر اس کتاب میں تشنگی تھی۔ بعدازاں ممدوح محمد فضل علی شاہ قریشیؒ کے نواسے مولانا کلیم اللہ شاہ نے کتاب کی دوبارہ اشاعت کا بیڑہ اُٹھایا اور مواد جمع کر کے زوّار حسین شاہؒ کے سپرد کیا۔(۲۶) پھر صاحبِ سوانح کے خلیفہ محمد عبدالمالک کی تالیف ''تجلیات'' بھی شائع ہوگئی۔(۲۷) اس کے بعد ایک نامعلوم فرد کی تحریر کردہ ''بیاض'' سوانح نگار کو حاصل ہوئی،(۲۸) جس میں صاحبِ سوانح کے بارے میں معلومات تھیں۔ الغرض ان تمام مواد اور دیگر معلومات کو سوانح نگار نے حسن اور سلیقے سے ''مقاماتِ فضلیہ'' میں پیش کیا ہے۔ اس طرح آپ نے یہ بھی بیان کیا ہے: ''مقصد اشاعت سلسلہ وتبلیغ دین اور افادہ عامۃ المسلمین ہے۔''(۲۹) کتاب کی افادیت بڑھانے کے لیے سلسلے کے اسباق کی تشریح اردو میں کی ہے اور ختمات شریف بھی درج کردیے ہیں۔(۳۰)

اس پیش کش میں جدید تحقیقی انداز کا حامل ہے۔ جس کتاب سے معلومات اخذ کی ہے۔ اُس کا حوالہ حاشیے میں دے دیا گیا ہے۔ معلومات کو مِن وعَن نہیں لیا۔ اُسے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس وجہ سے پوری کتاب میں اسلوب یکساں نظر آتا ہے۔ اور جہاں عبارت مِن وعَن لی ہے وہاں قوسین تو نہیں دیے مگر دونوں طرف مخصوص فاصلہ دے کر نمایاں کردیا ہے جو جدید تحقیقی انداز ہے۔(۳۱) اسی طرح جہاں عبارت میں موجود نکتے کے بارے میں تفصیلی معلومات کی ضرورت تھی۔ اُسے بھی حاشیے میں بیان کیا۔ جیسا کہ ممدوح کے خلیفہ سید لعل شاہؒ(۳۲) اور خواجہ سراج الدینؒ(۳۳) کا ذکر آیا تو ان کا مختصر تعارف حاشیے میں بیان کیا۔ تفصیلی حاشیے میں ایک ندرت یہ ہے کہ اگر کچھ حواشی کا لوازمہ اگلے صفحے پر ہے تو اس کے لیے

''جاری'' اور ''بقیہ اگلے صفحے پر'' کی عبارت درج نہیں کی بلکہ اُس کی جگہ بائیں جانب رخ والی ''انگلی کی تصویر'' دے دی۔ اسی طرح ''گذشتہ سے پیوستہ'' کی جگہ دائیں جانب رخ والی ''انگلی کی تصویر'' دے دی۔ غالباً یہ طریقہ سوانح نگار کا نہیں ہے بلکہ ناشر کا محسوس ہوتا ہے۔ کیوں کہ جدید ایڈیشن سوانح نگار کے وصال کے بعد منصّہ شہود پر آیا۔ خیر تحقیقی نقطۂ نظر سے پرانا طریقہ ہی مناسب اور معقول معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور خوبی جو اس پیش کش میں ہے جو قابلِ تقلید ہے۔ کتاب کے ہر صفحے کے اوپر دائیں جانب کتاب کا نام اور بائیں جانب باب کا عنوان درج کر دیا ہے۔ جس سے قاری کی توجہ مرکزی نکتے پر قائم رہتی ہے۔ اگر چہ کچھ صفحات میں تصحیح خوانی کی خامی رہ گئی ہے۔ صفحہ نمبر ۵۲ تا ۶۸ میں عنوان ''اخلاق و عادات'' ہے مگر کاتب نے سابقہ عنوان ''کرامات و تصرفات'' ہی رہنے دیا ہے۔ الغرض تحقیقی حوالے سے زیرِ بحث سوانح خانقاہی ادب کے ضمن میں معیاری نوعیت کی حامل ہے۔

''مقامات فضلیہ'' میں ماقبل دونوں سوانحوں کا عکس نمایاں ہے۔ بلکہ اس میں تحقیقی و تنقیدی حوالے سے مزید بہتری ہوئی ہے۔ دیباچے میں رائج خانقاہی نظام اور معاشرے میں موجودہ منفی رجحانات کو بھی رقم کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''آج کل اخباری اور اشتہاری پروپیگنڈے کا زمانہ ہے، دنیا شہرت اور اکثریت کے ساتھ چلتی ہے، ذاتی قابلیت پر لوگوں کی نظریں کم جایا کرتی ہیں۔ خصوصًا روحانی تربیت کا سلسلہ جو کہ سطحی نظر سے دُور تر اور حواسِ ظاہری کے ادراک سے وراء الورا ہے اور اہلِ دنیا کی عقلیں اس کے سمجھنے سے قاصر اور نگاہیں خیرہ ہیں، عوام کالانعام [جانوروں کی طرح] بلکہ بہت سے خواص بھی شعبدہ بازوں اور اخباری و اشتہاری پروپیگنڈہ سازوں کے ساتھ لگ جاتے ہیں۔''(۳۴)

زیرِ بحث کتاب کے بھی سید زوّار حسین شاہؒ نے کئی عنوانات قائم کیے ہیں۔ اُن میں بیش تر ایک منطقی ترتیب موجود ہے۔ اوّل ''خاندانی حالات'' کے بارے میں ہے۔ جس میں ضمنی سرخیاں ولادت، سلسلۂ نسب، تعلیم و تربیت وغیرہ ہیں۔ آپؒ کا تعلق قریشی خاندان سے تھا۔ سلسلۂ نسب میں آپؒ کے عہد کے بعد تک کا بیان کیا ہے۔(۳۵) گویا موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ کتاب کو ابواب میں تقسیم نہیں کیا گیا۔ چھوٹے چھوٹے عنوانات دے کر معلومات فراہم کی گئیں ہیں۔ ''کشف و کرامات اور الہام و تصرفات'' والا عنوان مفصل ہے۔ کرامات کے حوالے سے سابقہ سوانحی کتب میں ایک احتیاط نظر آتی تھی۔ کچھ واقعات کو بیان کرنے کے بعد ''واللہ اعلم بالصواب'' تحریر ہوتا تھا۔ ''مقاماتِ فضلیہ'' میں خرق العادات واقعات جن کتب سے اخذ کیے ان کے نام دیے ہیں مگر کئی جگہوں پر صفحے نمبر نہیں دیے۔(۳۶) اسی طرح کئی کرامات کے حوالے میں ''مرتب'' تحریر کیا ہُوا ہے۔(۳۷) اس بات کی وضاحت نہیں کہ انھوں نے یہ واقعہ براہِ راست سنا یا کوئی اور راوی ہے؟ عبارت سے محسوس ہوتا ہے کہ خود ہی سنا ہوگا کرامات کے بارے یہ نقطۂ نظر بھی پیش کیا ہے کہ کسی سے کرامات کا ظہور ہو تو وہ واقعی ولی

ہو۔ جب کی معجزہ نبوت کی دلیل ضرور ہے۔ سنّت کے پابند ولی کی کرامات اس کی بزرگی اور مقبولیت کی تائید کرتی ہے۔[۳۸] سوانح نگار نے دیباچے اور کتاب کے آغاز ہی میں آپؒ کے لقب ''غریب نواز'' کا تذکرہ کر دیا ہے۔ اس لیے پوری سوانح میں ممدوح کے لیے 'بیش تر' غریب نواز'' اور چند ایک مقام پر'' غریب النواز'' بھی استعمال کیا ہے۔ یہ سوانح نگار کی اپنے ممدوح سے محبت اور عقیدت کی غمّاز ہے۔ خانقاہ سے وابستہ افراد اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ خواجہ غریب نواز حضرت معین الدین چشتیؒ کا لقبِ خاص ہے۔ جب کہ سید زوّار حسین شاہ نے اپنے ممدوح کے لیے صرف ''غریب نواز'' اور'' غریب النواز'' استعمال کیا ہے۔

سید زوّار حسین شاہؒ کا ''مقاماتِ فضلیہ'' میں اسلوب اختصار اور جامعیت کا حامل ہے۔ الفاظ کا انتخاب میں ادبیت نمایاں ہے۔ فارسی، اردو اشعار، عربی مقولے، قرآنی آیات اور احادیث سے بیان کو واضح اور پُر تاثیر کیا گیا ہے۔ البتہ مذکورہ خوبیوں میں یکساں معیار نہیں ہے۔ قرآن کی جہاں بھی آیات دیں ہیں، اردو ترجمہ اور حوالے کے ساتھ ہیں۔ جب کہ احادیث اور دعاؤں کے بیان میں بہت کم جگہ عربی عبارت[۳۹] اور حوالے ہیں، محض ترجمہ یا مفہوم پیش کیا ہے۔[۴۰] فارسی اشعار کے اردو معنی تحریر نہیں کیے گئے ہیں۔ جس کی ضرورت اس لیے زیادہ محسوس ہوتی کہ اب فارسی سے آگاہ قاری کی تعداد بہت ہی کم رہ گئی ہے۔ فارسی اشعار کا اردو ترجمہ دینے سے قاری زیادہ محظوظ اور متأثر ہوسکتا ہے۔ اسلوب کا نمونہ ملاحظہ کیجیے جس میں ممدوح فضل علی قریشیؒ کی سیرت کو بیان کیا گیا ہے۔

> ''آپؒ کی خانقاہ یا مدرسۂ سلوک کو دیکھ کر اصحابِ صفہ رضی اللہ عنہم کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ صوفیائے کرام میں خانقاہ قائم کرنے کا رواج اصحابِ صفہؓ کی اتباع میں سلف سے جاری ہے۔ زمانۂ سلف صالحین کی تاریخ و سِیَر میں اکابر اولیائے امّت کی خانقاہوں کے تفصیلی حالات ملتے ہیں۔ حضرت غریب نواز قدس سرہ نے بھی مشائخ کا اتباع کرتے ہوئے پہلے فقیر پور میں اور پھر باہر سے آنے والے حضرات کی سہولت کے پیشِ نظر مسکین پور میں خانقاہ قائم فرمائی اور آخر دم تک اس خانقاہ میں اپنے مریدین و منتسبین کی اصلاح و تربیت فرماتے رہے۔ امیر و غریب، عالم و بے علم، ہر طبقے اور ہر علاقے کے لوگ اس خانقاہ میں حاضر ہوکر اپنے نفوس کی اصلاح اور اپنے قلوب کی جِلا کراتے تھے، اصحابِ صفہ کی خانقاہ کا صحیح نقشہ یہاں نظر آتا تھا۔''(ص۱۶)

> ''اُن تمام اوصاف کے مالک اور ان من جملہ محامد ومحاسن کے جامع تھے، جو مردان خدا اولیا باصفا میں ہونی چاہیے۔ آپ عالمِ باعمل، متبع شریعت وسنّت، قاطع

بدعت تھے اور قناعت وتوکّل، ورع و تقوا، صدق وصفا، عفّت وحیا، حلم وسخا، ایثار ووفا، ضبط وعفو، صبر وشکر، تسلیم ورضا، غرض یہ کہ تمام اوصاف حمیدہ کے جامع تھے۔ آپؒ کی مجلس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور ذکر الٰہی کے سوا کوئی بات نہ ہوتی تھی اور مجلس سے اُٹھ کر خانگی ضروریات جو حقوق العباد کا شعبہ ہے، انجام دیتے تھے۔ آپؒ کی صحبت میں بیٹھنے سے خدا یاد آتا تھا اور دل میں دنیا کی طرف سے بے توجہی اور لاتعلقی پیدا ہوتی تھی۔''(۴۱)

کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۳۹۳ھ/ ۱۹۷۳ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ دوبارہ یہ کتاب زوّار حسین شاہؒ کے وصال کے کچھ عرصے بعد ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء اور سوم جدید اشاعت جولائی ۲۰۰۴ء میں ہوئی۔

سید زوّار حسین شاہؒ سندھ کے خانقاہی ادب کے وہ روشن ستارے ہیں، جس کی روشنی نے بڑی تعداد میں لوگوں کے قلبوں کو منوّر کیا اور تا قیامت کرتی رہے گی۔ اوّل، انھوں نے روحانی ورثہ کو تحریری طور پر آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کیا، تاکہ وہ اس سے ہر دور میں فیض پاتے رہیں۔ دوم، ان کے تربیت یافتہ افراد نے اُن کے وصال کے بعد بھی، اُن کے مشن کو مستقل جاری رکھا ہُوا ہے۔ بلکہ اس تناور روحانی اور علمی درخت سے حاصل ہونے والے بیجوں نے بھی اب تناور درخت کی شکل اختیار کر لی اور ایک خلقت اِن کے سائے میں پُرسکون زندگی بسر کر رہی ہے۔ سید زوّار حسین شاہؒ نے سوانح ''حضرت مجدد الف ثانیؒ'' کی طرز پر ''انوارِ معصومیہ'' بھی مرتب کی۔ اس میں مجدد الف ثانیؒ کے فرزند اور سلسلۂ نقشبندیہ کو عروج دینے والی ہستی خواجہ محمد معصومؒ کی سوانح حیات کو پیش کیا ہے۔

''انوارِ معصومیہ'' کی ترتیب وتحقیق اپنے اندر کئی خصوصیت کی حامل ہیں۔ اس میں صاحبِ سوانح کے حالات کو سال بہ سال پیش کیا ہے، جب صاحبِ سوانح کو سجادہ نشینی عطا ہوئی تو اس کے بعد سے خواجہ محمد معصومؒ کے حالاتِ زندگی کو سجادہ نشینی کی نسبت سے ''سجادہ نشینی کا پہلا سال''، ''سجادہ نشینی کا دوسرا سال'' وغیرہ کے عنوانات دے کر، اُس سال کے اہم نکات کو قلم بند کیا ہے۔ جس طرح آپ کو دوسرے سال میں ''عروۃ الوثقیٰ'' کا لقب دیا گیا۔ اس انداز سے، آپ کے سجادہ نشینی کے متواتر پینتالیس سال تک کے حالات کتاب میں رقم کیے گئے ہیں۔ دوسری اہم خصوصیت اس کی یہ ہے کہ اس میں خواجہ محمد معصومؒ کی دو کتابوں کے مکمل اردو تراجم سید زوّار حسین شاہؒ نے کر کے کتاب میں شامل کیے ہیں۔ ایک آپؒ کا سفر نامۂ حرمین شریفین جو فارسی میں تھا اور اس کا اردو ترجمہ نہیں ہوا تھا۔، دوسرا رسالہ ''اذکارِ معصومیہ''، جس میں عربی اور فارسی عنوانات تھے۔ یہی نہیں آپ کی دیگر کتب سے بھی اوراد شاملِ کتاب کیے گئے ہیں۔ سوانح نگار کے مطابق زیادہ تر لوازمہ خواجہ کمال الدین کی کتاب ''روضۃ القیومیہ'' سے لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر کتب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ جن کی فہرست ''کتابیات'' میں دی گئی ہے۔ ''انوارِ معصومیہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ثناالحق صدیقی لکھتے ہیں:

''خواجہ محمد معصومؒ کے حالات و کوائف سے ابھی تک کسی نے اعتنا نہیں کیا تھا۔شاہ صاحبؒ چوں کہ اسی سلسلے کے شیخِ طریقت تھے۔اس لیے ان سے بہتر اس موضوع کو کون بیان کرسکتا تھا۔انھوں نے اس مضمون پر قلم اُٹھایا اور قطعۂ قرطاس پر اس قدر مواد جمع کر دیا، جس کا کسی کو وہم وگمان بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ظاہر ہے کہ جہاں پہلے کچھ بھی نہ ہو وہاں اتنا کچھ مواد فراہم کر دینا ایک اعجاز ہے۔''(۴۲)

''انوارِ معصومیہ'' کے ذریعے سید زوّار حسین شاہؒ کی شخصیت کے بھی کچھ پہلوؤں سے آگہی ہوتی ہے۔ان میں ایک تو یہ کہ آپ بہت زیادہ احتیاط فرماتے تھے۔جس کا تذکرہ ناشر محمد اعلیٰ نے کیا ہے کہ غلطیوں کی درستی کے بعد بھی بغور ملاحظہ فرماتے اور جب تک مکمل اطمینان نہ ہوجاتا، طباعت کی اجازت نہیں دیتے۔دوسری آپ کی انکساری طبیعت، جس کا اظہار اِن جملوں سے ہوتا ہے۔'' پیشِ نظر تالیف ''انوارِ معصومیہ'' میں بھی سابقہ تالیف ''حضرت مجدد الف ثانیؒ'' کی طرح مواد کی فراہمی اور مضامین کی تیاری میں بیش تر حصّہ حاجی محمد اعلیٰ صاحب قریشی سلّمہٗ اللہ تعالیٰ کا رہینِ منت ہے اور حاجی صاحب کے تیار کردہ حصّے پر عاجز نے نظرِ ثانی کر لی ہے۔''(۴۳) تیسرا پہلو یہ ہے کہ آپ کے پیشِ نظر افادیت کی بہت اہمیت ہے۔اس لیے اکابرین کے علمی سرمائے کو عوام وخواص کی فلاح وبہبود کے لیے اُن تک پہنچانے کے قائل ہیں۔مقدمے میں قرآنی آیات اور حدیث مبارکہ کا ترجمہ پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ''ان ارشاداتِ مبارکہ سے واضح ہے کہ اس امّت کے ہر فرد کے لیے ضروری ولازمی ہے کہ مخلوقِ خدا کی فلاح وبہبود کے لیے نیک کاموں کا حکم کرے اور برے کاموں سے روکے اور شریعتِ مطہرہ کی تبلیغ واشاعت کے لیے دل وجان سے کوشاں رہے۔''(۴۴) یہی وجہ ہے کہ خواجہ محمد معصومؒ کی کتاب، رسالہ اور اوراد کا اردو ترجمہ کرکے کتاب میں شامل کیا۔یہی وہ صفات ہیں، جو خانقاہوں سے تعلق رکھنے والے بزرگوں کی ذات کا حصّہ رہی ہیں۔

سید زوّار حسین شاہؒ نے کتاب کے جو ابواب بنائے ہیں۔ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے، حیاتِ مبارکہ، اولادِ امجاد، شاہانِ مغلیہ ایک نظر میں، اذکار وادعیہ، کشف وکرامات، تعلیمات، خلفائے عظام اور مکتوب علیہم وغیرہ۔سب سے طویل باب ''تعلیمات'' کا ہے جو ۱۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔یہ تعلیمات آپؒ کے مکتوبات سے اخذ کی گئی ہیں۔''حضرت مجدد الف ثانیؒ'' کتاب میں بھی تعلیمات کا باب سب سے طویل ہے، گویا سوانح نگار کی نظر میں تعلیمات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔جس کی پیروی پر آپ زور دیتے رہے۔

کتاب کے محرکات تو کم وبیش وہی ہیں جو ''حضرت مجدد الف ثانی'' کے تھے یعنی اصلاح النّاس۔اُس کتاب کی تحریر کے بعد سوانح نگار کو یہ احساس ہونے لگا کہ مجدد الف ثانیؒ کی سوانح کا ایک اور گوشہ تکمیل طلب ہے، جس میں اولاد امجاد کی سوانح اور ان کے علمی وروحانی کمالات شامل ہیں کیوں کہ یہ اُن ہی کی تربیت کا نتیجہ ہیں۔گویا تعلیماتِ مجدّدی کا تسلسل ہیں۔اس طرح آپ کی تعلیمات میں مزید جامعیت پیدا ہوجائے گی۔ اس خیال کے پیشِ نظر ''انوارِ معصومیہ'' تحریر کی

گئی۔(۴۵) ''انوارِ معصومیہ'' کا اندازِ تحریر وہی ہے جو ''حضرت مجدد الف ثانیؒ'' کا ہے، دیکھیے۔

> ''حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ السّامی کے سب سے بڑے صاحب زادے حضرت خواجہ محمد صادق سرہٗ تھے۔ جن کی ولادت ۱۰۰۰ھ میں ہوئی۔ اولیاے کبار میں سے تھے۔ ۱۰۲۵ء میں اپنے والد بزرگوار کی حیات ہی میں وصال فرما گئے۔ دوسرے صاحب زادے حضرت خواجہ محمد سعید سرہٗ تھے۔ جن کی ولادت ماہ شوال ۱۰۰۵ھ میں ہوئی۔ آپ بھی صاحبِ کمال بزرگ گزرے ہیں۔ ۱۰۷۰ھ میں وصال فرمایا۔ تیسرے صاحب زادے حضرت عروۃ الوثقیٰ خواجہ محمد معصوم قدس سرہٗ ہیں، جن کا مبارک تذکرہ پیش نظر ہے۔ آپ کے بعد یکے بہ دیگرے تین صاحب زادوں خواجہ محمد فرخ، خواجہ محمد عیسیٰ اور خواجہ محمد اشرف کی ولادت ہوئی جو کم سنی ہی میں انتقال فرما گئے، البتہ ساتویں سب سے چھوٹے صاحب زادے حضرت خواجہ محمد یحییٰ قدس سرہٗ کی ولادت ۱۰۲۴ھ میں ہوئی اور ۱۰۹۶ھ میں انتقال فرمایا۔''(۴۶)

کتاب ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء میں مکمل ہوئی تھی، اس کی اشاعت بھی اسی سال ''ادارہ مجددیہ'' کراچی کے زیرِ اہتمام ہوئی مگر اُس وقت سید زوّار حسین شاہؒ کا وصال ہو چکا تھا۔

سید زوّار حسین شاہؒ کا مقام سندھ کے خانقاہی نظام اور خانقاہی ادب میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ آپؒ کے توسط سے پاکستان میں بالعموم اور سندھ میں بالخصوص سلسلہ نقشبندیہ کو فروغ حاصل ہُوا۔ آپؒ نے سلسلہ نقشبندیہ کو جس علمی خزانے سے نوازا، وہ قابل رشک اور قابلِ تقلید ہے۔ آپؒ کے لگائے ہوئے اس درخت کی شاخیں اس سرعت کے ساتھ پھیلیں کہ وہ تناور درخت کے روپ میں بدل گئیں۔ آپؒ کی سوانح محمد اعلیٰ قریشیؒ نے ''مقاماتِ زواریہ'' کے نام سے تحریر فرمائی۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاںؒ، زیرِ بحث کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ سوانح نگار جوانی ہی سے اپنے ممدوح کے قریب رہے اور یہ سلسلہ آخر دم تک برقرار رہا۔ سوانح لکھنے کے لیے ایسا ہی تعلّق ضروری ہوتا ہے۔ محمد اعلیٰ اپنے ممدوح سے محبت اور عقیدت رکھتے تھے، اس لیے ان کی خواہش تھی کہ یہ سوانح زیادہ سے زیادہ معتبر، معلوماتی اور جامعیت کی حامل ہو، اس مقصد کے لیے آپ نے مختلف رسائل اور ذرائع سے ممدوح کے حالات جمع کیے۔ یہی نہیں بلکہ عزیزوں اور بزرگوں سے بھی تحریریں لکھوائیں۔(۴۷)

کتاب کے محرکات کے حوالے سے مؤلف نے لکھا ہے کہ حضرت زوار حسین شاہؒ کی رحلت سے جو غم اور دکھ ہُوا، اپنے جذبات پر قابو پانا دشوار مرحلہ تھا۔ ان احساسات کے اظہار کا ایک طریقہ یہ تھا کہ اِن کا ذکر کیا جائے اور اپنے دل کو بہلایا جائے، کیوں کہ حدیث کی رو سے جس کو کسی سے محبّت ہوتی ہے وہ اس کا اکثر ذکر کرتا ہے، اسی ذکر کے سلسلے میں یہ سوانح

مرتب ہوئی۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ بزرگوں کا تذکرہ ان کی صحبت کا قائم مقام ہوتا ہے۔ تیسرا سبب یہ ہوا کہ بعض حضرات نے جو ملفوظات اور حالاتِ زندگی محفوظ کیے تھے، وہ مؤلّف کو حاصل ہوگئے۔(۴۸) چوتھی وجہ مصنف نے یہ لکھی کہ آپ اس پُرفتن دور کی ایک ایسی عظیم شخصیت تھے کہ جن میں علم وفضل، صلاح وتقویٰ اور شریعت وطریقت اور سنّت کی کمال درجے تابع داری موجود تھی۔(۴۹) یقیناً ان کے حالات سالکین اور عوام وخواص کے لیے رہنمائی کا باعث ہوں گے۔

اس سوانح کے کئی حصّے ہیں۔ اِن میں حالاتِ زندگی، آپ کے روز وشب، سنّت کی پیروی، مکتوبات، اسلام اور شاعری، بحیثیت شاعر، ملفوظات، فقہی بصیرت، کشف وکرامات، تالیفات وتراجم اور آپ کی سیرت اور علمیت پر وقیع نوعیت کے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ملفوظات مفتی مظہر بقاؒ، صوفی ذوالفقار، حاجی بشیر اللہ نے مرتب کیے ہیں۔ دیگر مصنفین میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خانؒ، مفتی مظہر بقا، مولانا محمد صادق، مولانا مفتی ولی حسن، مولانا محمد سلیم، ڈاکٹر ظہور احمد، مولانا سید محبوب واسطی وغیرہ شامل ہیں۔

سوانح میں سید زوّار حسین شاہؒ کے سلسلۂ نسب، خاندانی حالات، آبائی وطن، ولادت، والد ماجد کے حالات، مقامِ پیدائش، تعلیم، شادی خانہ آبادی کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی ہیں۔ یہی نہیں ملازمت، بیعت، خلافت اور سیرت کے بارے میں بھی جامع انداز میں تحریر کیا ہے، اس کے علاوہ آپؒ کے خلفا کے بارے میں بھی اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔ مؤلف نے آپ کی کتابوں کے اختصار سے تعارف بھی پیش کیے ہیں۔ الغرض اس کتاب کے مطالعے سے سید زوّار حسین شاہؒ کی علمی اور خانقاہی خدمات سے بخوبی آگہی ہوجاتی ہے۔

کتاب کا اسلوب یکساں نوعیت کا نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کتاب کے بیش تر حصّوں کو مرتب کرنے والے افراد الگ الگ ہیں لیکن جو حصّے مؤلّف نے ترتیب دیے ہیں، اُن میں سادگی کا حسن موجود ہے۔ اصلاحی نقطۂ نظر سے زبان وبیان میں سلاست کو مدِّ نظر رکھا گیا ہے۔ تحقیقی انداز بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ اختصار اور جامعیت بھی اس سوانح کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ اسلوب کی ایک جھلک ملاحظہ کیجیے:

> ''جب حضرت شاہ صاحبؒ کے سنّی عقائد کا علم آپ کے شیعہ رشتے داروں کو ہُوا تو وہ آپ کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں اور پریشانیاں پیدا کرنے کے درپے ہوگئے، جس سے آپ کے عزم واستقلال میں ان کی توقعات کے خلاف اضافہ ہی ہوتا گیا اور جب کوئی حربہ کارگر نہ ہُوا تو خاندان والے شیعوں نے آپ کے خلاف سوشل بائیکاٹ کی مہم شروع کردی یعنی سقّا، بھنگی، تیلی اور کمھار وغیرہ کو حضرتؒ کے ہاں کام کرنے سے روک دیا۔''(۵۰)

مذکورہ بالا کتاب کو ادارہ مجدّدیہ کراچی نے پہلی مرتبہ ۱۹۸۳ء/ ۱۴۰۳ھ میں شائع کیا، اس کا بیش تر لوازمہ

''بیادِ وقار حسین شاہؒ'' نومبر دسمبر ۲۰۰۸ء کو شائع ہونے والے ''تعمیرِ افکار'' کے خصوصی شمارے جلد ۹ شمارہ ۱۱، ۱۲، میں بھی شائع ہوا ہے۔ اِس شمارے کے مدیر ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن ہیں۔

آر۔ بی مظہری کی کتاب ''جہانِ مسعودؒ'' ڈاکٹر محمد مسعود احمدؒ کی سوانح حیات ہے۔ اِس میں آپ کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۸۵ء تک کی علمی خدمات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس میں مصنفہ نے آپؒ کے حالاتِ زندگی کو اجمالی طور پر پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر محمد مسعودؒ کی زندگی اور کتب کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس کی دو خصوصیات اہم ہیں، اوّل یہ کہ اس میں مصنفہ نے اپنے ذاتی خیالات اور رائے کا اظہار نہیں کیا ہے مگر آپ کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے دیگر مشاہیر کی آرا اور بیانات کو شاملِ کتاب کر دیا ہے۔ یوں مشائخ کی سوانح میں عقیدت کا جو پہلو ملتا ہے، وہ تحقیقی رنگ میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد مسعودؒ کے مختلف افراد کو لکھے گئے خطوط بھی سوانح میں شامل ہیں جو آپ کی علمیت اور کردار کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اِس سوانحی خاکے کو پیش کرنے کی وجہ آر۔ بی مظہری نے ''حرفِ آغاز'' میں یوں بیان کی ہے۔

> ''شاید قرئین کرام کو تعجب کہ صرف سوانحی خاکہ پیش کرنے پر کیوں اکتفا کیا گیا اور تفصیلاً عرض نہیں کیا گیا۔ ایسا اس لیے کیا گیا کہ سوانح نگار کی نظر میں تو شخصیت محبوب ہوتی ہے، اصل چیز یہ ہے کہ شخصیت کے بارے میں دوسرے لوگ کیا کہتے ہیں تو دوسرے بہت سے حضرات کے تاثرات اس سوانحی خاکے کے باب نمبر ۳ میں جمع کر دیے گئے ہیں، ان تاثرات اور دوسرے بہت سے حقائق سے شخصیت کے مختلف گوشے سامنے آجائیں گے اور انشاء اللہ قارئین کرام مزید تشنگی محسوس نہ کریں گے۔''(۵۱)

سوانح نگار کی مذکورہ بالا بات کسی حد تک درست معلوم ہوتی ہے؛ جو آرا آپ کے بارے میں دیگر افراد کی ہیں، ان سے شخصیت کے بہت سے گوشے منوّر ہو جاتے ہیں، نیز مؤلفہ نے اُن کتب کے نام بھی حرفِ آغاز میں تحریر کر دیے ہیں، جن میں آپ کی سیرت کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ راقم کو ڈاکٹر محمد مسعود احمدؒ کی پہلی برسی کے موقع پر میر پور خاص سے ایک مجلّہ کی اشاعت میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی تھی، جس میں لوگوں نے آپ کی شخصیت، علمی حیثیت اور کردار وصفات پر اظہار خیال کیا تھا۔ اُس سے شخصیت کے متنوع پہلوؤں سے آگاہی ہوئی تھی۔ بہ نسبت ایک فرد کی رائے کے، جس میں محبت اور عقیدت مندی کا عنصر بھی شامل ہو، اُس رائے کا سب کے لیے قابلِ قبول ہونا آسان نہیں ہے۔

حرف آغاز میں کتاب کا تعارف بھی دیا گیا ہے۔ کتاب کے باقاعدہ آغاز سے قبل ''عکس'' کے عنوان کے ضمن میں ۱۲ تصاویر دی گئی ہیں، جن میں ایم۔ اے اور پی ایچ۔ ڈی کی سندوں اور فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن کی وجہ سے جو تمغے ملے، اُن کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ کچھ تصاویر عمارات کی ہیں۔ ان میں سندھ یونی ورسٹی کی سابقہ عمارت، مدرسہ عالیہ مسجد جامع

فتح پور، دہلی اور اس کے دالان اور شاہ عبداللطیف گورنمنٹ کالج میر پور خاص کی ہے۔ان تصاویر پر کوئی معلومات (Caption) نہیں دی گئی ہیں۔آغاز میں ان کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں،جس سے بھرپور رہنمائی نہیں ملتی، بہ تر ہوتا کہ انھیں تصویر کے ساتھ دیا جاتا۔ان کی چھپائی بھی بہت مدھم ہے۔جس سے تصاویر کا کماحقہٗ مقصود حاصل نہیں ہوسکا۔ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔جس کی مختصر وضاحت ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

پہلا باب ''حیات'' پر مشتمل ہے،جس میں خاندان،تعلیم، تدریسی خدمات ،امتحانی خدمات اور مذہبی وقومی خدمات کے عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔اِن سرخیوں میں بڑی تفصیل کے ساتھ معلومات دی گئی ہیں۔ جیسے خاندان اور ننھیال کے متعلق، بھائیوں، بہنوں، برادر نسبتی، اولاد، سسرالی اکابر کے بارے معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ان کے علاوہ اُن مشائخ کا بھی ذکر ہے جن سے آپ نے استفادہ کیا۔اسی طرح دیگر عنوانات کے تحت بھی چھوٹی چھوٹی سی معلومات کو بھی تحریر اور محفوظ کیا گیا ہے۔کم وبیش یہی طریقہ کار تمام عنوانات میں برتا گیا ہے۔

دوسرا باب ''آثارِ علمیہ'' ہے۔جس کی ذیلی سرخیاں میں تصنیفات، تالیفات، تراجم، مقالات، مضامین،مقدمات، پیغامات، مکتوبات اور تبصرے شامل ہیں۔ایک ذیلی سرخی پیش لفظ پر مبنی بھی ہوسکتی تھی۔جوصفحہ ۸۲ پر موجود ہے،صرف کتب کے نام ہی نہیں دیے گئے ہیں بلکہ اُن کا مختصر تعارف اور اشاعت کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

اسی طرح تیسرا باب ''تاثرات'' کا ہے،جس میں مختلف شعبوں سے رکھنے والے افراد کی ڈاکٹر محمد مسعودؒ کے بارے میں آرا دی گئی ہیں۔چوتھا باب ''مکتوبات'' اور پانچواں باب ''اشاریات'' کا ہے۔مکتوبات میں وہ خطوط شامل کیے گئے ہیں، جو ڈاکٹر محمد مسعود احمدؒ کو تحریر کیے گئے۔ان خطوط کو بھی شعبہ جات کے اعتبار سے تقسیم کیا گیا ہے۔اِن ابواب میں معلومات تو بہت زیادہ ہے مگر اُن معلومات تک رسائی آسان نہیں کیوں کہ تفصیلی فہرست ابتدا میں نہیں دی گئی ،صرف ابواب کی فہرست دی گئی تو اُن کے صفحات نمبر تحریر نہیں کیے گئے۔صفحات نمبر کسی بھی باب یا ذیلی سرخی کے سامنے درج نہیں کیے گئے۔

اس کتاب کو تحریر کرنے کا مقصد ایک تو مصنفہ کی ڈاکٹر محمد مسعود احمدؒ سے محبت وعقیدت ہے اور کیوں نہ ہو کہ آپ کو ان کے والد شاہ محمد مظہر اللہؒ سے شرف بیعت حاصل ہے۔جس کا تذکرہ مؤلفہ نے انتساب میں کیا ہے،دوسرا محرّک یہ ہے کہ آپ کے حالات زندگی کو آپ کی زندگی ہی میں محفوظ کردیا جائے،تیسرا اہم محرک اصلاحی ہے۔یعنی ڈاکٹر صاحب کے علمی کارنامے جو حیرت انگیز ہیں،ان کے مطالعے سے اساتذہ اور نوجوانوں میں علم اوردین سے محبت اور اپنے اسلاف کے کارناموں سے آگہی حاصل ہو۔ممکن ہے یہ علمی خدمات ان کے لیے مشعلِ راہ بن جائے۔اس کا اظہار مؤلفہ نے حرفِ آغاز میں یوں کیا ہے۔

> ''امید ہے یہ کتاب ہماری نواجون نسل کے لیے مہمیز کا کام دے گی اور خصوصًا علمی اداروں کے اساتذہ اس سے یہ سبق حاصل کریں گے کہ وہ جو وقت بیکار باتوں میں

ضائع کر دیا جاتا ہے، اگر اس سے کام لیا جائے اور اس کو نظم وضبط کے ساتھ صرف کیا جائے تو زندگی میں بہت کچھ کیا جاسکتا ہے اور میر تقی میر کی اس نصیحت پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

ع ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو''(۵۲)

کتاب کا اسلوب فراہمیٔ معلومات کا سا ہے۔ کم از کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معلومات تحریر کی گئی ہیں۔ کتابوں کے تعارف میں مؤلفہ کی کچھ نثر دکھائی دیتی ہے، جس میں اختصار اور سادگی ہے۔ الفاظ وہ ہیں جو عام پڑھا لکھا فرد بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ ایک کتاب پر مؤلفہ کی رائے پیشِ خدمت ہے۔

''اس کتاب میں نہایت جامعیت کے ساتھ مولانا احمد رضا خان بریلوی کے حالاتِ زندگی اور عقائد وافکار وغیرہ جدید تحقیقی معیار کے مطابق پیش کیے گئے ہیں۔ ابتدا میں بہت سے فضلا و دانش وروں کی تأثرات ہیں، پھر مولانا بریلوی اور ان کے والد ماجد مولانا نقی علی خان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نادر نگارشات کے پچاس عکس ہیں۔ اس کے بعد حالاتِ زندگی اور افکار وعقائد وغیرہ پھر مآخذ ومراجع کی ایک طویل فہرست ہے۔ شائع کردہ، اسلامی کتب خانہ، اقبال روڈ، سیال کوٹ''(۵۳)

آر۔ بی مظہری کی کتاب ''جہانِ مسعود'' کو ادارۂ تحقیقاتِ امام احمد رضا کراچی نے پہلی مرتبہ ۱۹۸۵ء میں شائع کیا ہے۔

''سیرتِ ولی کامل'' اوّل حصّہ خواجہ اللہ بخش عباسی نقشبندی مجدّدی غفاری المعروف سوہنا سائیںؒ کی سوانح ہے۔ جسے مولانا حبیب الرحمان گبول طاہری ''حبیب بخشی'' نے مرتّب کیا ہے۔ مصنف اس سے قبل بھی خانقاہی ادب کے حوالے سے کئی کتابیں مرتب اور تحریر کر چکے ہیں۔ صاحبِ سوانح کے ساتھ آپ کئی سالوں تک رہے۔ سفر، حضر، جلوت اور خلوت میں قربت رہی، ایسا ہی شخص سوانح نگاری کا حق ادا کر سکتا ہے اگر چہ کہ مصنف کو اس بات کا پھر بھی احساس تھا کہ ''ایسی ہمہ گیر شخصیت کی سوانح تحریر کرنا چنداں آسان نہیں، جو نہ صرف پیرِ طریقت تھے بلکہ بیک وقت شریعت وطریقت کے مجمع البحرین اور ان گِنت ایسی صفاتِ حمیدہ کے مجموعہ تھے، جن میں سے ہر پہلو مستقل بحث اور مبسوط تصنیف کے قابل ہے۔''(۵۴) صاحبِ سوانح کے حالات معلوم کرنے کے لیے، اُن کے ہم عصر ساتھیوں، پڑوسیوں اور پرائمری اسکول کے ایک شاگرد سے معاونت لی اور ان کے تأثرات بھی قلم بند کیے۔

اس سوانح میں مصنف نے زندگی کے بیش تر پہلوؤں کے بارے میں عنوانات کے تحت معلومات فراہم کی ہیں۔ ان میں نام ونسب، ولادت، والد، دادا، والدہ پھوپھی، یعنی آپ کی زندگی سے جن شخصیات کا تعلق رہا، ان کے بارے

میں اختصار سے ضروری نکات بیان کیے ہیں، نیز آپ کی رسومات سے پاک شادی کی تفصیل، زوجہ کا وصال، بیعت، مرشد اور حضور ﷺ سے محبت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ آپؒ کی سیرت کے اُن پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے، جن سے عوام و خواص کو ہدایت حاصل ہو۔ غرض ایک بزرگ کی سوانح میں جو کچھ ہوسکتا ہے، وہ سب اس ''سیرتِ ولیٔ کامل'' میں بیان کر دیا ہے۔

اس سوانح کا ایک محرک تو حبیب الرحمان گبول کا صاحبِ سوانح خواجہ اللہ بخش نقشبندی المعروف سوہنا سائیں سے محبت اور عقیدت کا ہونا تھا، دوسری وجہ یہ تھی کہ آپ چاہتے تھے کہ جس طرح حیاتِ ظاہری میں لوگ آپ سے ہدایت حاصل کرتے تھے، اُسی طرح بعد از وصال بھی، آپ کی سوانح حیات سے استفادہ کرتے رہیں، یوں آپ کے حالاتِ زندگی صدقۂ جاریہ بن کر متعلقین کو فیض پہنچاتے رہیں۔

آپ کا انداز تحریر سادہ اور دل کش ہے، ہر ہر جملے سے محبت اور عقیدت کے پھول نچھاور ہوتے ہیں۔ جملوں میں روانی ہے۔ ادبی رنگ کی جھلکیاں جابجا نظر آتی ہیں۔ کہیں کہیں اشعار بھی بیان کیے گئے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو بھی عنوان کے تحت پیش کیا ہے۔ ممدوح کی اپنے مرشد سے محبت کا ایک واقعہ ملاحظہ کیجیے۔ اس کے راوی مولانا بخش علی صاحب ہیں۔

> ''ایک مرتبہ میہڑ کے قریب فقیر قادر بخش ڈیپر کے یہاں جمعہ کی رات دعوت تھی، حضور سوہنا سائیں نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ مولانا حاجی بخش صاحبؒ، مولانا نثار احمد صاحب بھی اس دورے میں شامل تھے۔ جمعہ نماز دوسرے گاؤں میں پڑھنے کا پروگرام تھا۔ صبح سویرے دوسرے خلفا کرام وہاں چلے گئے۔ حضور کا پروگرام کچھ بعد جانے کا تھا، میں بھی آپؒ کے ساتھ ٹھہر گیا۔ فقیر صاحب صبح کا ناشتا لے آئے۔ ایک دو لقمے ہی کھائے تھے کہ رحمت پور شریف سے ایک آدمی حضرت پیر مٹھاؒ کا خط لے آیا۔ جس میں حضرت سوہنا سائیںؒ کو فوراً رحمت پور شریف پہنچنے کا حکم درج تھا۔ کھانا کھائے بغیر اسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے فرمایا: جلدی چلیں بس آرہی ہے، الغرض رادھن پہنچنے کے بعد مجھے اپنے گھر جانے کا حکم فرمایا اور خود اکیلے رحمت پور شریف روانہ ہوگئے۔''(۵۵)

کتاب کی پہلی اشاعت ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۷ء عرس مبارک سوہنا سائیں اور دوسری ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۴ء، ادارۃ المعرفہ، درگاہ اللہ آباد شریف، کنڈیارو، ضلع نوشہرو فیروز، سندھ سے ہوئی۔

حبیب اللہ گبول (حبیب بخشی) نے ''سیرت ولیٔ کامل'' کی پہلی جلد میں خواجہ اللہ بخش نقشبندی المعروف سوہنا سائیں کے حالاتِ زندگی اور سیرت کے بارے میں تحریر کیا تھا۔ اُس کی پذیرائی کے بعد سوہنا سائیں سے متعلق دیگر اہم معلومات، جن میں صاحبِ سوانح کی تبلیغی اور اصلاحی خدمات کو پیش کیا ہے۔ اِس کے علاوہ زیرِ بحث کتاب میں اُن کے مکتوبات، ملفوظات اور ایک مقالے کو بھی پیش کیا ہے۔ مکتوبات مرشد خواجہ محمد عبدالغفار رحمت پوریؒ، صاحب زادے، مولانا محمد

طاہر سجن سائیں، خلفائے کرام کو تحریر کیے گئے ہیں۔ نیز وہ خطوط بھی کتاب میں شامل کیے گئے ہیں جو آپ کے حکم سے دیگر افراد نے رقم کیے تھے۔ ابتدائی خطوط مرشد خواجہ عبدالغفار نقشبندیؒ کے نام ہیں، جن کے مطالعے سے صاحبِ سوانح کی احتیاط کا اندازہ اور مرشد کی محبت کا پتا چلتا ہے۔ لکھتے ہیں: ''دست بستہ باادب عرض کہ تین سال پہلے کوئٹہ آنا ہوا تھا، کسی مرتبہ کپڑا اور سامان وغیرہ نہیں خریدا۔ گذشتہ دوسال سے یہ صورت حال وقوع پذیر ہوئی کہ شیطان نے کپڑا خریدنے کے لیے مائل کر لیا۔''(۵۶) کوئٹہ میں سستا کپڑا ملتا تھا، تو سلسلے کے دوسرے لوگ بھی کپڑا خریدتے تھے۔ انھوں نے اہلیہ کو کپڑا نہ خریدنے پر راضی کر لیا مگر جب سب لوگ کپڑا خریدنے لگے تو ان کی بیوی نے بھی کپڑا خریدنے کی فرمائش کی۔ اس بات کے درست یا نا درست ہونے کا خط میں مرشد سے معلوم کیا ہے۔ خریداری کی مرشد نے اجازت عطا کی اور اس عمل کو جائز کہا۔ آپ کا طویل مقالہ عمدہ لباس اور خوراک کے موضوع پر ہے۔ جس میں انھوں نے صحابہؓ کے علاوہ امام جعفر صادقؒ، حسن بصریؒ اور دیگر ہستیوں کی مثالیں دے کر ثابت کیا ہے کہ خوش لباسی کی اسلام میں ممانعت نہیں ہے۔ مشاہدات وتأثرات میں خلفا کرام، مریدین اور دیگر افراد کے سوہنا سائیں کے بارے میں تأثرات نقل کیے ہیں، آخر میں خلفا کی فہرست اور شجرہ بھی دیا گیا ہے۔ اسی طرح ''سیرت ولی کامل'' کے دوسرے حصّے کی اشاعت نے، پہلے حصّے کے حسن میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

دوسرے حصّے کی اشاعت کا محرک ایک تو اوّل حصّہ بنا، کیوں کہ اسے بہت پذیرائی ملی، جس کی وجہ سے خواجہ محمد طاہر نے دیگر اہم لوازمہ بھی فراہم کیا، پھر سوہنا سائیں خواجہ عبدالغفارؒ کی زندگی کا ایک اہم پہلو اصلاح وتبلیغ تھا جو پہلے حصّے میں بھرپور نہ آسکا تھا، کتاب کے پہلے باب میں اس پر تفصیلی تحریر کیا گیا ہے۔ اس سوانح کی وجہ تسمیہ مصنف کی زبانی سنیے:

> ''پیشِ نظر کتاب (سیرتِ کاولی مل) ان [سوہنا سائیں] ہی کی سیرت وسوانح حیات پر مشتمل ہے لیکن اس کی اشاعت کا مقصد محض ان کی شخصیت کو نمایاں کرنا نہیں، بلکہ بنیادی غرض ومقصد شریعت وطریقت کے مختلف زاویوں کو حضور نور اللہ مرقدہٗ کی عملی زندگی کی صورت میں نمایاں کرنا ہے۔ تاکہ قارئین بھی آپ کی طرح اپنی مستعار زندگیوں کو اسلامی احکام کے قالب میں ڈھال کر، ظاہر کے ساتھ اپنا روحانی و باطنی پہلو کو بھی سنواریں اور اپنے حقیقی معبود ومحبوب کی معرفت حاصل کر کے کامیاب و پاکیزہ زندگی بسر کریں۔''(۵۷)

مصنف کے انداز و بیان کا ذکر تو سیرتِ اوّل میں کیا تھا۔ صاحبِ سوانح سوہنا سائیںؒ کی زبان دانی کی مہارت کا اندازہ ان جملوں سے بآسانی ہوتا ہے، جو انھوں نے اپنے مرشد کو خط میں تحریر کیے تھے۔ یہ اسلوب ان کے شدتِ جذبات کی بھی بھرپور ترجمانی کر رہا ہے۔

> ''دشمنوں نے حال ہی میں جو جدید حملہ بغض وشرارت کیا، اس سے دل کو صدمہ اور دکھ پہنچا،

کئی شیطان لعین حاسد جل سڑ رہے ہیں مگر حاسد دشمن کے منہ میں خاک، دائمًا خوار، ذلیل، مقہور ومخزول رہے ہیں اور رہیں گے، اللہ تبارک وتعالٰی نے آں حضرت بابرکت سائیں کو پہلے ہی منصور، مامون، فتح یاب، کامیاب، کامران، سرفراز، سرخرو، سربلند رکھا ہے۔ اب بھی رکھا ہے، آئندہ بھی حضور ہمیشہ کامران وسربلند رہیں گے۔''(۵۸)

کتاب کی اشاعت اوّل ۱۹۹۲ء اور بارِ دوم ۲۰۰۳ء، الاصلاح پبلی شرز دادو کے تحت ہوئی۔

''حیاتِ بقا'' محمد مظہر بقاؒ کی خودنوشت ہے، عمومًا خانقاہی نظام سے وابستہ افراد اپنی خودنوشت تحریر نہیں فرماتے۔ اِسی لیے خانقاہی ادب میں ایسی مثالیں شاذ و نادر ہی ملیں گی کہ کسی صوفی نے اپنے حالاتِ زندگی کو خود ہی بیان کیے ہوں۔ کیوں یہ عمل خودستائش اور خودنمائش کے زمرے میں آجاتا ہے۔ خودنوشت بھی سوانح ہی کی ایک قسم ہے۔ خودنوشت اور سوانح میں ظاہرًا تو فرق صرف صیغے کا ہے۔ اول الذّکر میں ''وہ'' اور ثانی الذّکر میں ''مَیں'' کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی سوانح میں راقم فردِ دیگر جب کہ خودنوشت میں محرّر خود اپنے حالات وواقعات بیان کرتا ہے۔ داخلی طور پر سوانح میں حالات نویس مدّاح اور نقّاص بھی ہوسکتا ہے جب کہ خودنوشت میں اپنے اوصاف کا بیان آسان نہیں ہوتا۔ پھر بھی دونوں میں فرد کے حالاتِ زندگی ہی بیان کیے جاتے ہیں۔

خانقاہی ادب میں دیگر اصناف کی طرح آپ بیتی یا خودنوشت تحریر کرنے کا بنیادی مقصد بھی عمومًا اخلاقی اور اصلاحی ہوتا ہے۔ آپ بیتی کے ذریعے مصنف اپنے تجربات اور یادوں کو دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے تاکہ عوام وخواص اور دیگر قارئین اُس کے زندگی کے تجربات سے استفادہ کرسکیں۔ اس تحریر کا اہم ترین مقصد بھی کم وبیش یہی ہے، دیگر محرّکات میں اہم بات یہ ہے کہ اِن کے نام کا آخری جزو ''بقا'' اس کتاب کا اہم سبب بنا، جو اُن کے دوست احمد مرتضٰی وکیل نے دیا تھا، پھر اُن کے فرزندوں اور پوتوں نے بھی اِس جزو کو اپنے نام کا آخری جزو بنالیا۔ اُن کے خیال میں نام کے ساتھ ''بقا'' جزو بنانے کی روایت مستقبل میں بھی جاری رہی تو، کم ازکم آنے والی نسل کو یہ تو معلوم ہو کہ یہ ''بقا'' کون اور کیا تھے؟ جن کے نام یہ خاندان منسوب ہے۔ گویا اس کتاب کے اوّلین مخاطب آنے والی نسل ہے۔ ہر فرد کی زندگی میں دوسروں کے لیے نصیحت کے پہلو ہوتے ہیں۔ اُن کی زندگی کے تجربات سے استفادہ اُسی صورت میں ممکن ہوتا ہے، جب وہ زندگی تحریری طور پر محفوظ ہو، جب کہ خاص افراد کی زندگی سے آگہی خاص افراد کو جنم دیتی ہے۔ اسی لیے بقا صاحب نے تحریر فرمایا کہ ''تاہم کچھ بعید نہیں کہ دوسروں کو بھی اس [خودنوشت] میں عبرت کا کچھ سامان میسر آجائے کیوں کہ میری زندگی اللہ کے فضل اور محض اسی کی توفیق سے اپنی جدوجہد کی ایک مسلسل داستان ہے۔''(۵۹)

''حیاتِ بقا'' یوں تو خودنوشت اور آپ بیتی ہے مگر اس میں جو لوازمہ پیش کیا گیا ہے۔ اِس میں اُنھوں نے اپنے بارے میں اہم معلومات ہی پیش نہیں کی بلکہ اپنی زندگی کا تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ اپنے خاندان اور دیگر عزیز واقارب

کا اس کتاب میں ذکر حقیقت پسندی کے ساتھ کیا ہے، انھوں نے خود کو اور نہ ہی اپنے خاندان کے کسی فرد کو بالا مقام تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔ ''حیاتِ بقا'' یوں تو خانقاہی نظام سے وابستہ فرد کی تحریر ہے، مگر اس میں بسنے والے تمام افراد حقیقی دنیا میں سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ بقا صاحب نے اپنے جن رشتے داروں کا تعارف اس کتاب کے توسط سے کرایا ہے۔ ان میں اُن کے دادا باقر علی، تایا واحد علی جو علم وادب کے شائق تھے۔ نیاز فتح پوری کے ''نگار'' کے ایسے دل دادہ تھے کہ بیماری کی حالت میں فرمایا کہ ''تمنّا یہ ہے کہ نگار کا اس ماہ کا شمارہ اور پڑھ لوں، پھر چاہے مرجاؤں۔''(۶۰) جب کہ اُن دنوں نیاز فتح پوری اسلامی ڈگر سے ہٹے ہوئے تھے۔، والد ثامن علی جو اولاد میں دوسرے نمبر پر تھے، اس لیے اُن کے بارے میں لکھا ''پیدائش کی ترتیب میں ثانی تھے اور نام تھا ثامن'' عربی میں ثامن آٹھویں کو کہتے ہیں۔ والد کے بارے میں لکھا کہ ''پورے خاندان کی طرح میرے والد بھی غصّے کے بہت تیز تھے۔ رمضان المبارک کی شاموں میں اُن کا غصّہ عروج پر ہوتا تھا، سب سہمے رہتے تھے۔''(۶۱) چچا حامد علی کے بارے میں لکھا کہ انھوں نے جائیداد کی لالچ میں ایک بڑے جاگیردار کی بہن سے شادی کی تھی مگر جب جائیداد نہ ملی تو اس کے حصول کے لیے مقدمہ کیا، جس کے اخراجات میں اُن کے اپنے خاندان کی جائداد بھی نہ صرف برباد ہوگئی بلکہ اُن کے والد کو قیمتی اور کثیر برتن بھی فروخت کرنے پڑ گئے۔(۶۲) والدہ نعیمہ خاتون کی محبت کا ذکر بڑی عقیدت سے کیا گیا ہے، پھوپھا حکیم یار محمد جو ایک چھوٹی ریاست کورائی کے سرکاری طبیب تھے، اُن کی بزرگی کو مظہر بقا نے تسلیم کیا ہے اور پھوپی کی زبانی اُن کا ایک محیر العقل واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ وہ جب سحری لے کر مسجد پہنچی تو اُن کے تمام اعضا جدا تھے۔(۶۳) تایازاد بھائی محمد ناصر انصاری کا ذکر دیگر کے مقابلے میں تفصیل سے کیا ہے۔ اُن کی زندگی کے بہت سے گوشوں کو بیان کیا ہے، اُن کی شادی کا منظر تو کسی جدید فلم کا سین معلوم ہوتا ہے۔ اُن کے بارے میں اختصار سے یہ لکھا کہ ''حسن، جوانی اور دولت یک جا ہوکر جو رنگ لاتی ہے وہی رنگ ناصر بھائی کی زندگی کا تھا۔''(۶۴) ان کی زندگی کے بیان میں بھی کچھ ماورائی واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کے اُن کے بارے ایک سنیاسی نے کہا تھا کہ اُن کا بڑھاپا تکلیف دہ ہوگا۔ جو بالآخر ہُوا۔ اُن کی شرافت کے پہلوؤں کو بھی بیان کیا ہے۔ کرداروں کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مظہر بقاؔ نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا، اُسے سادگی، حقیقت پسندی اور بے تکلفی سے بیان کر دیا۔

حقیقت پسندانہ رجحان صرف دوسرے افراد ہی کے لیے نہیں اختیار کیا بلکہ خود کی زندگی کے بھی ایسے کئی واقعات بیان کیے ہیں۔ ایک موقع پر لکھا ہے کہ حج کا ایک گروپ، جس میں اُن کی بیوی کا حقیقی بھانجا، اس کے کچھ رشتے دار اور ایک جوان رنڈی شامل تھی، وہ گروپ کی دعوت کرنا چاہتے تھے مگر اُس رنڈی کو بلانے میں پس وپیش کا شکار تھے، بیوی سے دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا ''کیا آپ کا گھرانہ اللہ کے گھر سے بھی زیادہ مقدّس ہوگیا کہ اللہ نے تو اسے اپنے گھر بُلا لیا لیکن آپ کو اسے اپنے گھر میں بُلانے میں شرم آرہی ہے۔''(۶۵) اِس کے باوجود وہ اُسے اپنے گھر بلانے کی جرأت نہ کر سکے۔ انھوں نے اس عمل کو اپنی تنگ ظرفی سے محمول کیا اور کٹر مذہبی بیوی کی وسعتِ قلبی کی داد دی ہے۔

خودنوشت کا ایک اہم کردار اُن کی بیوی صفیہ خاتون ہیں، جن کی خوبیوں کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ اُن کی نیک صفتی کا اندازہ ایک اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب مظہر بقا اپنا نیا گھر بیوی کو مہر میں دے رہے تھے، تو اُنھوں نے کہا کہ گھر تو میرا ہی ہے کیوں نہ مہر معاف کر کے مزید ثواب کماؤں۔ مظہر بقا کی یہ بات تو اُن کی دین داری پر مہر ثابت کر دیتی ہے جو انھوں نے ۱۹۷۰ء کے حج کے موقع پر طواف کے دوران کہی کہ ''آپ جنّت میں جائیں تو خدا کے لیے مجھے بھول نہ جائیں۔''(۶۶) مگر اُن کا عیب بیان کرنے کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ وہ اپنا عیب اور میرا ہنر مشکل سے تسلیم کرتی ہیں، اگر تسلیم کر بھی لیا تو اپنے عیب پر چراغ پا ہو جاتی ہیں۔

یہ خودنوشت زبان و بیان کے حوالے سے ایک ادبی رنگ لیے ہوئے ہے، پوری کتاب میں آمد کا غلبہ دکھائی دیتا ہے، کہیں محسوس نہیں ہوتا کہ جملے کو حسین بنانے کے لیے الفاظ کا چناو کیا گیا ہو۔ اِس لیے یہ اندازِ بیان ایسی روانی لیے ہوئے کہ تخلیقی حدوں کو چھو لیتا ہے۔ ضرب الامثال اور تشبیہات کے استعمال سے اس کے حسن میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ ایک موقع پر اُن کے دوست نے (جو بیوی کے ستائے ہوئے تھے) مظہر بقا کی بیوی کی فرمان برداری دیکھ کر کہا، تم نے اپنی بیوی کو کتنا دبا رکھا ہے، تو مظہر بقا نے جواب دیا کہ ''جو فطری طور پر نوکرانیوں کا مزاج لے کر پیدا ہوئی ہو، اُسے دبا کر رکھنے کی کیا ضرورت ہے، چلتے بیل کو آر کون لگاتا ہے۔'' خودنوشت کے اسلوب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جہاں عربی فارسی نثر یا اشعار تحریر کیے ہیں، وہاں اُن کا ترجمہ لازمی دیا ہے۔ اس کے لیے صفحہ نمبر ۲۰، ۲۴، ۵۶ وغیرہ ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ موجودہ دور میں عربی فارسی سے واقف قارئین کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے تراجم دینے سے قاری اُن سے محظوظ اور مستفید ہو سکتا ہے۔ نیز سمجھانے کے لیے واقعات اور مثالوں کا استعمال کیا ہے، جس سے بات مؤثّر اور مدلّل ہو گئی ہے۔ فاتحہ یا قرأتِ قرآن کے ثواب مُردوں کو پہنچنے کی دلیل یوں دی کہ جو کچھ میّت کو پہنچانا چاہتا ہے، غریبوں کو دے کر اللہ کے سپرد کر دے، اللہ تعالیٰ اُسے میت تک اُس صورت میں پہنچا دے گا جو اُس کے لیے مناسب ہو، اِس بات کو سمجھانے کے لیے انھوں نے دوسرے ملک سے رقم بھجوانے کی مثال دی کہ جس طرح پاکستان میں بنک سعودی عرب سے بھیجے گئے ریال کو روپے میں تبدیل کر کے ادا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا سے بھیجی گئی شے کو نورانی شکل میں تبدیل کر سکتے ہیں۔(۶۷) آپ کی اس اسلوب کی داد سید محمد ابوالخیر کشفی نے یوں دی ہے۔ ''مولانا مظہر بقا بھی ایک ''عجوبہ'' ہیں کہ مولوی ہوتے ہوئے بھی تخلیقی اور زندہ نثر لکھتے ہیں۔ یہ زندگی اور تخلیق جو آج مولویوں میں ناپید ہے۔ کبھی اِنھیں کے ذہن اور قلم سے ہماری زبان کو نصیب ہوئی تھی، مولانا مظہر بقا اِنھیں اسلاف کی یادگار ہیں۔''(۶۸)

ایک پورا باب علمی زندگی کے عنوان سے ہے۔ جس میں آپ کی تحقیق و تالیف کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اسی طرح آپ کے افکار و نظریات، تفہیم کا انداز، عقائد، اولاد کی تفصیل اور دیگر نجی معلومات کو حقیقت پسندی کے ساتھ بیان کیا ہے، الغرض ''حیاتِ بقا'' مظہر بقا کی زندگی کے بارے میں بنیادی اور اہم معلومات کا اوّلین مآخذ ہے۔

خانقاہیت کی لہر جہاں بھی ہے، انتہائی مؤثر ہے۔قول وفعل میں مناسبت کے لیے اپنی انا کو قربان کرنے کا واقعہ اس میں موجود ہے، ایک واقعہ تو ابوالخیر کشفی نے بیان کیا ہے کہ جب وہ یہ حدیث پڑھانے جارہے تھے، جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی سے قطع تعلق رکھے، اتفاق سے ایک دوست سے اُن کی بات چیت بند تھی۔فوراً اعلی الصّبح اس کے گھر پہنچ کر غیر مشروط معذرت کرلی۔(۶۹) اسی طرح شعبے میں سادگیٔ لباس کا معاملہ آیا تو آپ نے شیروانی کا لباس ترک کردیا۔بیعت وخلافت کے زمرے میں حسین مدنیؒ سے اپنی بیعت کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔(۷۰) جب کہ ''کچھ یادیں'' سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب سے پہلے انھیں سے بیعت ہوئے۔(۷۱) اُن کے بعد شاہ زوّار حسین سے پھر ڈاکٹر غلام مصطفٰی خان کے مرید ہوئے۔جنھوں نے آپ کو تحریری خلافت عطا فرمائی تھی، جس کا عکس کتاب میں دیا گیا ہے۔

آپ بیتی کے بارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے تحریر کیا تھا کہ ''سب سے اچھی آپ بیتی وہ ہوتی ہے جو کسی بڑے دعوے کے بغیر بے تکلّف اور سادہ اَحوالِ زندگی پر مشتمل ہو۔''(۷۲) حیاتِ بقا اُس معیار پر پوری اُترتی ہے۔''حیاتِ بقا'' کا اوّل ایڈیشن ۱۹۹۴ء میں شائع ہُوا تھا، جب کہ زیرِ بحث ایڈیشن میں آپ کی دوسری کتاب ''کچھ یادیں'' بھی شامل ہے۔اِسے زوّار اکیڈمی پبلی کیشنز کراچی نے ۲۰۰۶ء میں شائع کیا ہے۔

''سراج الادب'' پروفیسر محمد وکیل احمد کی وہ کتاب ہے، جس میں ڈاکٹر غلام مصطفی خانؒ کی زندگی، علمی خدمات کا جائزہ تاریخ وار لیا گیا ہے۔اس کتاب میں مؤلف کا تحریر کردہ مقدمے کے علاوہ ممدوح کا سوانحی خاکہ، علمی، ادبی اور تحقیقی خدمات، اساتذہ اور تلامذہ، اعزازات وتمغات اور ایک انٹرویو کو شامل کیا ہے۔انٹرویو روزنامہ جنگ میں ۳۱ مئی ۱۹۹۶ء کے جمعہ ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔

مقدمے میں ڈاکٹر غلام مصطفٰی خانؒ کی شخصیت اور علمی وادب مقام پر انتہائی اختصار سے جامع انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے، نیز آپ کے باطنی مقام سے آگہی کے لیے مکتوباتِ زوّاریہ (حصہ اوّل) مرتبہ ڈاکٹر حافظ منیر احمد، مکتوبات زوّاریہ (حصّہ دوم) مرتبہ پروفیسر محمد وکیل احمد اور تاریخِ اسلاف کے مطالعہ کا مشورہ دیا گیا ہے۔مختصر سوانحی خاکے میں معلومات کو مختصر جملوں میں تاریخی اعتبار سے ''سال بہ سال'' کے عنوان سے ترتیب دیا گیا ہے۔جس سال میں دو یا دو سے واقعات پیش آئے، انھیں الگ الگ پیراگراف میں قلم بند کیا۔صاحبِ سوانح کے ۱۹۹۵ء تک کے حالاتِ زندگی کے اہم واقعات درج کیے ہیں۔سنین عیسوی اور ہجری دونوں تحریر کیے ہیں۔ملاحظہ کیجیے:

''۱۹۱۲ء/ ۱۳۳۰ھ

حضرت صاحب مدظلہٗ کی ولادت باسعادت دوشنبہ، ۱۰ شوال المکرم ۲۳ ستمبر، بوقت فجر، جبل پور (سی پی۔ بھارت)

۱۹۱۷ء/ ۱۳۳۶ھ

کٹنی (ضلع جبل پور) میں پہلی کلاس میں داخلہ لیا۔

۱۹۱۸ء/ ۱۳۴۱ھ

☆ پانچویں کے امتحان میں پورے شہر میں اوّل پوزیشن حاصل کی اور چار سال کے لیے چار روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا۔

☆اس سال پرائمری کی پانچویں جماعت ختم ہوئی اور چوتھی جماعت کو پرائمری کی آخری جماعت قرار دیا گیا۔'' (۷۳)

''علمی ادبی اور تحقیقی خدمات'' کے ضمن میں آپ کی کتب کے تکمیلی سن، اشاعت کی تفصیل اور دو یا تین جملوں میں کتاب کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔اس عنوان کی پیش کش میں سنین کی تاریخی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا اور صرف عیسوی سن دیے گئے ہیں۔ایک جھلک اس کی بھی دیکھیں:

''(۱۲) سراج البیان (۱۹۹۲ء)

گراں قدر تحقیقی مقالات ومضامین کا مجموعہ ہے۔ ۱۹۹۲ء میں کراچی سے شایع ہُوا۔

(۱۳) متین برہان پور کے مرثیے (۱۹۵۶ء)

یہ تحقیقی مضمون ''علمی نقوش'' میں شامل کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں شایع ہوا۔

(۱۴) ادبی جائزے (۱۹۹۵ء)

مختلف ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئے۔'' (۷۴)

مذکورہ بالا اقتباس میں ''سراج البیان'' کا سنہ ۱۹۹۲ء تحریر کیا ہے، جب کہ کا ڈاکٹر مسرور احمد زئی نے اس کتاب کا سن ۱۹۹۶ء تحریر کیا ہے۔ (۷۵) اسی طرح ''ادبی جائزے'' میں سرخی میں ۱۹۵۹ء کی بجائے ۱۹۹۵ء تحریر ہے جو کاتب سے سہو ہُوا ہے۔اس کی تصدیق بھی مسرور احمد زئی کے مقالے سے ہوتی ہے۔ (۷۶) اساتذہ وتلامذہ اور اعزازات وتمغات کو بھی اختصار سے بیان کر دیا گیا ہے۔ یہاں فہرست میں سہو ہوا۔ کتاب میں اوّل اعزازات وتمغات اور پھر اساتذہ اور مشہور تلامذہ کا ذکر ہے۔تلامذہ میں سے چند یہ ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر نجم الاسلام، ڈاکٹر اسلم فرخی، جسٹس نعیم الدین، ڈاکٹر خاور جمیل، ڈاکٹر محمد مسعود احمدؒ اور ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ وغیرہ۔

جنگ میں شامل انٹرویو میں انٹرویو لینے والا کا نام تحریر نہیں کیا ہے۔ یہ ایک بھرپور اور جامع انٹرویو ہے۔جس میں نہ صرف آپ کی شخصیت اور علمی خدمات کا پتا چلتا ہے بلکہ قدیم وجدید ادب اور تحقیق کے معیارات کی صورتِ حال کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔موجودہ تحقیق سے ڈاکٹر غلام مصطفی خاںؒ مطمئن نہیں مگر اسے بھارت کی تحقیق سے بہت بہتر سمجھتے ہیں۔مختلف

پہلوؤں پر آپؒ کے نظریات کا بھی اس انٹرویو سے پتا چلتا ہے۔

کتاب تحریر کرنے کا بنیادی مقصد مصنّف نے مقدمے میں بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ''یہ کتاب ڈاکٹر حضرت والا کی علمی اور تحقیقی خدمات پر آئندہ تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بھی مفید ثابت ہوسکتی ہے۔''(۷۷) طبع اوّل ۱۹۹۷ء/۱۴۱۸ھ میں المصطفیٰ ایجوکیشنل سوسائٹی، کراچی سے ہوئی۔

ڈاکٹر ابوالخیر محمد زبیر کی تصنیف ''بزمِ جاناں'' خواجہ رکن الدّین الوریؒ کے سوانحی حالات پر مشتمل ہے۔صاحب سوانح، سوانح نگار کے دادا ہوتے ہیں۔اس سوانح کے محرکات وہی ہیں جو اولیاے کرام کے حالاتِ زندگی قلم کرنے کے ہوتے ہیں، یعنی عوام النّاس بالخصوص حلقۂ ارادت کی اصلاح۔اس ضمن میں مصنف نے ایک علمی مقدّمہ بھی تحریر کیا ہے، جس میں قرآن واحادیث کی روشنی میں صالحین کی صحبت اختیار کرنے کی افادیت بیان کی ہے۔صاحب زادہ ابوالخیر نے مقدمے میں صحبت کی دو اقسام بیان کی ہیں، پہلی ظاہری اور دوسری باطنی یا معنوی، ثانی الذّکر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں مطلوبہ شخصیت سامنے نہیں ہوتی، مگر ان کی شخصیت، کردار، عادات واطوار اور کمالات کی ایسی تصویر کشی کی جاتی ہے کہ وہ شخصیت سامنے محسوس ہوتی ہے۔(۷۸) زیرِ بحث سوانح میں یہ خوبیاں بڑی حد تک پائی جاتی ہیں۔ان سوانح کا ایک مقصد آخرت کی بھلائی بھی ہوتا ہے کہ ولی کے حالات قلم بند کرنے کا عمل ہی بخشش کا بہانہ بن جائے یا کسی شخص کی اصلاح بزرگ کے حالات کے مطالعہ سے ہوجائے تو، وہ بھی شفاعت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔یہ نکتہ بھی مصنف نے بیان کیا ہے۔(۷۹)

ڈاکٹر صاحب زادہ ابوالخیر نے سوانح لکھنے میں تحقیقی انداز اختیار کیا ہے۔خیالات کے گھوڑے نہیں دوڑائے بلکہ حقائق کا واضح اظہار کیا ہے۔سوانح کے دو اہم بنیادی مآخذ کی عدم موجودی کا برملا اعتراف اور افسوس کیا ہے۔لکھتے ہیں کہ صدمہ اس بات کا ہے کہ خواجہ رکن الدّین الوریؒ کے مکتوبات تلف ہوگئے اور اُن کے ہم عصروں کی بڑی تعداد بھی دنیا سے رختِ سفر باندھ چکی ہے، جو ہم عصر حیات ہیں، ان کے نام تحریر کرکے، ان کی موجودی پر خدا کا شکر ادا کیا ہے۔جن لوگوں نے سوانح لکھنے میں معاونت کی، ان کا شکریہ بھی ادا کیا ہے۔(۸۰)

''بزمِ جاناں'' میں صاحبِ سوانح کے جو حالاتِ زندگی قلم بند کیے ہیں، ان میں سنین کی کمی نمایاں محسوس ہوتی ہے، اس کی وجہ صاحب زادہ ابوالخیر زبیر نے یہ بیان کی ہے کہ ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند کے ہنگاموں میں صاحبِ سوانح کا عظیم کتب خانہ الور میں تباہ ہوگیا تھا، جس میں علمی نوادرات کے علاوہ شجرۂ نسب، تاریخِ ولادت اور خاندانی حالات کے قلمی مخطوطات بھی تلف ہوگئے تھے۔(۸۱) یہی وجہ ہے کہ آپ کا سنِ ولادت اور دیگر سنین بھی نہیں دیے گئے، لیکن آپ کی ولادت کی خوش خبری کے بارے ولیوں کی پیش گوئیوں کا بیان شاملِ کتاب ہے۔آباواجداد کے بارے میں بھی بہت زیادہ معلومات فراہم نہیں کی ہے۔سوانح کا اسلوبِ بیان اس قدر دل کش ہے کہ قاری تصنیف کے مطالعے میں مگن رہتا ہے اور صاحبِ سوانح کے اعلا کردار اور صفات سے آگاہ ہوتا ہے۔

''بزمِ جاناں'' کا مقصد کیوں کہ اصلاحِ افراد ہے،اس لیے ممدوح کے کردار اور اخلاق کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ جس پر سوانح نگار نے مفصل روشنی ڈالی ہے۔یہی نہیں اخلاق وصفات کے بیان میں قرآن واحادیث اورخوب صورت اشعار کے استعمال سے بیان کی وقعت اورحسن میں اضافہ کیا ہے۔تفصیلی حالات کے سبب اس میں ایک اچھی سوانح کی خوبیاں پائی جاتی ہیں، اِس میں ممدوح کے دورِ طفل اور تحصیلِ علم کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔علاوہ ازیں آپ کو جن فنون پر مہارت حاصل تھی ،ان کا ذکر بھی کیا گیا ہے، ان مین فنِ قرأت،فنِ خطاطی،فنِ طباعت اور فنِ تکسیر وتعویذ شامل ہیں۔ممدوح کی سیرت کے جن اہم پہلوؤں پر خامہ فرسائی کی گئی ہے، اُن میں ممدوح کے معمولاتِ روز وشب،تواضع و انکساری،امانت داری،سادگی،شجاعت،مہمان نوازی،شوقِ مطالعۂ کتب ،سخن فہمی وسخن سنجی،تحمّل و بردباری وغیرہ کو بیان کیا ہے۔مذکورہ خوبیوں کے علاوہ خواجہ رکن الدینؒ کے روحانی معاملات اور کرامات کو بھی اختصار سے بیان کیا ہے۔نیز تبلیغِ دین اور اصلاحی حوالے سے انھوں نے جو خدمات انجام دیں ہیں، ان کا تذکرہ بھی خصوصی طور پر کیا گیا ہے۔یہی نہیں ممدوح کے ملفوظات اور چند ایک مکتوبات بھی کتاب کی زینت بنے ہیں،جن سے صاحبِ سوانح کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

''بزمِ جاناں''میں صاحب زادہ ابوالخیر نے تحقیقی انداز اپنایا ہے۔جہاں کہیں بھی کسی کتاب سے استفادہ کیا ،اس کی تفصیل حاشیے میں بیان کردی ہے۔سوانح میں جو عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ان کی مکمل فہرست مع صفحات نمبر کتاب کے شروع میں دے دی ہے۔جن کتب سے مستفیض ہوئے ہیں،ان کا ذکر مآخذ کے طور پر کتاب کے آخر میں کردیا ہے۔قرآنی آیات کے حوالے میں پارہ اور رکوع کے حوالے دیے ہیں۔جب کہ جدید تحقیق میں سورت کا نمبر یا نام اور آیت کے نمبر دیے جاتے ہیں۔ابتدا میں تصاویر کی فہرست دی ہے مگر ان کے صفحات نمبر نہیں دیے ہیں ۔جب کہ ان تصاویر کے مقامات کا پتا موضوعات کی فہرست سے معلوم ہوتی ہیں۔

''بزمِ جاناں'' کی سب سے اہم خاصیت اس کا سلوبِ بیان ہے۔جس میں زبان وبیان کی چاشنی ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔اس اسلوب کی ایک خاص بات اس میں موقع کی مناسبت سے اردو، فارسی اور عربی کے اشعار پیش کیے ہیں، جو حسنِ بیان میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔خطابیہ انداز بھی زیرِ بحث کتاب میں موقع بہ موقع دکھائی دیتا ہے۔اس کا طرزِ تحریر ایک اعلا ادبی معیار کا حامل ہے۔طرزِ تحریر کی مذکورہ خصوصیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سوانح نگار کو اردو اور دیگر زبانوں پر قدرت حاصل ہے۔اسلوب کی مثال دیکھیے:

> ''حضرت کو ۱۳۰۴ھ میں شرفِ بیعت حاصل ہُوا،اس وقت سے اعلا حضرت کے وصال یعنی ۱۳۰۹ھ تک مسلسل پانچ سال مرشد کی خدمت میں آپ نے اکتسابِ فیض کیا،منازلِ سلوک طے کیے،مجاہداتِ شاقّہ اور ریاضاتِ شدیدہ کی صیقل سے آئینۂ قلب کو چمکایا، اور پھر نسبتِ قویّہ اور لطائفِ ستّہ سے اس کو جگمگایا،معارف لدنیہ اور

علومِ باطنی سے اس کو سجایا محبوب کے انوار و تجلیّات کی جلوہ گاہ بنایا، الغرض اس ''رِ
ضاے مرشدؒ'' حاصل کر کے رضاے مولا و رضاے مصطفی کو بھی پایا۔''(۸۲)

''بزمِ جاناں'' کو رکن الاسلام پبلی کیشنز حیدرآباد نے اپریل ۲۰۰۳ء میں شائع کیا۔

جاوید اقبال مظہری مجددی ڈاکٹر محمد مسعود احمدؒ کے خلفا میں سے ہیں۔ نیز آپ کو سلسلۂ چشتیہ میں صاحب زادہ ابوالخیر ڈاکٹر محمد زبیر سے بھی اجازتِ بیعت حاصل ہے۔ ''مجدد اعظم برحق'' آپ کی ایک مختصر کتاب ہے، جس میں شیخ احمد سرہندیؒ کے ''مجدد الف ثانی'' ہونے کے بارے میں اولیا کرام کے ارشادات اور روحانی مراتب بیان کیے ہیں۔ آغاز میں ایک حدیث بھی بیان کی گئی ہے، جس میں بغیر نام لیے ایک پیش گوئی ہے کہ گیارھویں صدی کے شروع میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ دو جابر بادشاہوں کے درمیان ایک ایسا شخص بھیجے گا جو میرا ہم نام ہوگا، نورِ عظیم الشان ہوگا، ہزاروں انسان اس کی شفاعت سے جنت میں داخل ہوں گے۔''(۸۳) مذکورہ حدیث خواجہ کمال الدین محمد احسان کی کتاب ''روضۃ القیومہ'' سے ماخوذ ہے۔ صحاح ستہ یا کسی اور حدیث کی کتب سے نہیں لی گئی ہے۔ ایک اور حدیث جلال الدین سیوطی کی کتاب ''جوامع الجوامع'' سے پیش کی گئی ہے جو ''جواہرِ مجددیہ'' میں دی گئی ہے، جسے ''حدیثِ صلہ'' کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد مصنف نے ''امام احمد سرہندیؒ'' لی ہے۔ علاوہ ازیں مجدد الف ثانیؒ کی کتب اور مکتوبات سے بھی ایسے شواہد پیش کیے ہیں، جن سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ آپؒ واقعی مجدّد ہیں۔ ملاحظہ کریں:

''حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے دو جابر بادشاہوں کے سامنے کلمۂ حق ادا فرمایا اور حکومت
کا رخ اسلام کی طرف موڑ دیا..... حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے تحریک احیاے دین کے
ذریعے ایک عظیم انقلاب برپا کیا اور خون کا ایک قطرہ بھی نہ بہایا۔''(۸۴)

اسی طرح معرفتِ الٰہی کا جو علم آپؒ کو عطا ہُوا، وہ بہت ہی کم ہستیوں کے حصّے میں آیا۔ یہ وہ اسرار ہیں، جنھیں پوشیدہ رکھنا ہوتا ہے۔(۸۵) آپؒ کی طرف سے چلنے والی احیاے دین کی تحریک، اُس وقت بھی ہندوستان کی سرحدیں پار کر چکی تھی اور اب ساری دنیا میں نہ صرف مقبول ہے بلکہ جس طرح چہار دانگ عالم میں وحدانیت اور عشقِ رسول ﷺ کا پیغام عام کر رہی ہے، اس کی مثال شاذ و نادر ہی ملے گی۔ اُن ممالک اور بڑے شہروں کی تفصیل مولانا جاوید اقبال نے صفحہ نمبر ۱۹ پر دی ہے، جن میں ترکیہ، قازان، تاتارستان، باشقرستان، قفقازات، جزیرہ نماے کریمہ، خوارزم، آذربائیجان، وسطی ایشیا، حجاز، یمن، بغداد، شام، مصر، ترکستان، چین، بدخشاں، بخارا، سمرقند، اصفہان، استنبول، تبریز، مکہ، بنگال وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ امام ربانیؒ کی حیات، افکار، تعلیمات اور خدمات پر ساری دنیا میں جو علمی اور تحقیقی کام ہُوا اور ہو رہا ہے، وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی مثالیں جو بڑی تعداد میں ہیں، مصنف نے صفحہ نمبر ۲۵ پر بیان کی ہیں۔ ان میں مانچسٹر یونی ورسٹی لندن یونی ورسٹی (یوکے)، لیڈن یونی ورسٹی (ہالینڈ)، میکگل یونی ورسٹی (کینیڈا) گلاسکو یونی ورسٹی (امریکا)، مرمرا یونی ورسٹی (استنبول، ترکی)

وکٹوریہ یونی ورسٹی (سوئٹزرلینڈ)، ڈھاکا یونی ورسٹی (ڈھاکا، بنگلہ دیش)، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی (علی گڑھ انڈیا) کے علاوہ پاکستان میں سندھ یونی ورسٹی (جامشورو سندھ)، پنجاب یونی ورسٹی (لاہور پنجاب)، بہاؤالدین یونی ورسٹی (ملتان، پنجاب) کراچی یونی ورسٹی (کراچی) وغیرہ میں کام ہوا اور ہو رہا ہے۔ان کاموں کے علاوہ ڈاکٹر محمد مسعود احمدؒ کی زیرِ نگرانی ''جہانِ امام ربانی'' کے عنوان سے پندرہ جلدوں میں جو انسائیکلو پیڈیا تیار ہُوا ہے، جس کے بارے میں علما اور محققین کی رائے ہے کہ گذشتہ چار سو سالوں میں کسی شخصیت پر اس قدر کام نہیں ہُوا۔ان کے علاوہ کئی اور پہلو بھی مصنف نے ایسے بیان کیے ہیں، جن سے امام ربانیؒ کی عظمت اور مجدّد ہونے کے دلائل ملتے ہیں۔

کتاب کا محرک ''نویں امام ربانی کانفرنس'' ہوئی۔اس موقع کی مناسبت سے مجدّد الف ثانیؒ پر یہ کتاب منظر عام پر لائی گئی۔دوسرا محرک یہ ہے کہ مصنف مولانا محمد اقبال مظہری خود نقشبندی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔تیسرا محرّک ڈاکٹر محمد مسعود احمدؒ کا مجدد الف ثانیؒ سے عشقیہ تعلق ہے۔مصنف کی تربیت انھیں کی زیرِ نگرانی ہوئی، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ محمد مسعود احمدؒ کے عشق کی خوش بو سے مصنف محروم رہتے۔

''مجدد اعظم برحق'' میں مصنف کا طرزِ تحریر مختصر پیراگراف پر مشتمل ہے۔جنھیں نمبر دیے گئے ہیں۔چند ایک نمبر دو ڈھائی صفحات پر مشتمل ہیں۔باقی آدھے صفحے یا سات آٹھ سطروں پر مشتمل ہیں۔انھیں عنوانات بھی نہیں دیے گئے ہیں مگر ہر پیراگراف میں کوئی نہ کوئی صفت بیان کی گئی ہے۔زبان و بیان روز مرّہ کے مطابق ہے جسے عام قاری بآسانی سمجھ سکتا ہے۔جاوید اقبال مظہری کا نمونۂ نثر ملاحظہ کیجیے:

> ''حضرت مجدد الف ثانیؒ صرف دو ہزارے کے ہی مجدّد نہیں تھے بلکہ مجدّد اعظم کی حیثیت سے آپ کا فیض آج بھی ساری دنیا میں جاری ہے۔آپ کا فیض، اکبر اور جہاں گیر کے ادوار میں صرف ہندوستان تک محدود نہ تھا بلکہ آپ نے اپنے خلفا اور سفرا کے ذریعے قرآن وسنت کی تعلیمات کو ساری دنیا میں پھیلایا اور سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کا نور سارے عالم میں پھیلایا۔''(۸۶)

جاوید اقبال مظہری کی کتاب ''مجدد اعظم برحق'' کو مظہری پبلی کیشنز کراچی نے ۲۰۰۹ء/۱۴۳۰ھ میں شائع کیا۔

سندھ کے مشائخ نقشبند کی مذکورہ بالا سوانح عمریوں کے محرکات میں جو نکات اہمیت کے حامل ہیں، اُن میں سلسلے سے گہری وابستگی، مرشد یا اکابر شیخ سے والہانہ محبت اور عقیدت کے عناصر شامل ہیں۔ان کے علاوہ سوانحوں کو ضبطِ تحریر لانے میں مرشد یا اکابرِ سلسلہ کے حالات و واقعات کو محفوظ کرنے کا جذبہ بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ان سوانحوں کو قرطاس پر مرتسم کرنے کے پس منظر میں اصلاحی مقصد بھی نمایاں ہے۔کیوں کہ یہ سوانح صحبت صالحان کی کمی کو پورا کرنے میں معاون ہوسکتی ہیں۔

ان سوانحوں کے اسلوب میں سادگی اور عام فہم الفاظ کا استعمال تو مشترک ہے مگر خالص ادبی رنگ کچھ سوانحوں میں

نظر آتا ہے۔اسی طرح قاری کی آسانی کے لیے ابواب، اُن کی ذیلی سرخیاں اور فہارس کی تیاری میں تو ندرت دکھائی دیتی ہے مگر جدید تحقیقی رجحان کہیں کہیں ہی دکھائی دیتا ہے۔تنقیدی اور تجزیاتی عنصر بھی ان سوانحوں میں کم ہی نظر آتا ہے۔البتہ یہ سوانح خانقاہی ادب کے بنیادی مقصد اصلاح اور سوانح نگاری کے اہم نکتے افادی پہلو کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔

حواشی:

(۱) ڈاکٹر یونس حسنی، کاوشیں، میرپورخاص: فرہنگ، ۲۰۰۳ء، ص ۳۶، اشاعت دوم

(۲) ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر خلیق انجم، اصنافِ ادب اردو، علی گڑھ: سرسید بک ڈپو، ۱۹۹۶ء، ص ۱۳۹

(۳) ڈاکٹر یونس حسنی، کاوشیں، محولہ بالا، ص ۳۷

(۴) سیّد زوّار حسین شاہ، حیاتِ سعیدیہ، کراچی: ادارہ مجددیہ، ۱۹۸۷ء، ص ۶، اشاعت دوم

(۵) ایضاً، ص ۷، ۸

(۶) ڈاکٹر صاحب زادہ ابوالخیر محمد زبیر، بزمِ جاناں، حیدرآباد: رکن الاسلام پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۰، اشاعت اوّل

(۷) سیّد زوّار حسین شاہ، حیاتِ سعیدیہ، محولہ بالا، ص ۵

(۸) ایضًا، ص ۷

(۹) ایضًا

(۱۰) ایضًا، ص ۱۰

(۱۱) ایضًا، ص ۶۶، ۶۷

(۱۲) ڈاکٹر پروفیسر محمد مسعود احمد، حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری علیہ الرحمۃ، کراچی: ادارۂ مسعودیہ، ۱۹۹۸ء، ص ۳۲، طبع ثانی

(۱۳) ایضًا، ص ۵۱

(۱۴) ایضًا، ص ۲۴

(۱۵) ایضًا، ص ۲۴، ۲۵

(۱۶) ایضًا، ص ۲۵

(۱۷) ایضًا، ص ۱۹

(۱۸) ایضًا، ص ۵۱

(۱۹) ایضًا، ص ۷۰

(۲۰) سیّد زوّار حسین شاہؒ، حضرت مجدد الف ثانی، کراچی: ادارہ مجددیہ، ۱۹۸۳ء ص ۲۲، تیسرا ایڈیشن

(۲۱) ایضاً، ص ۲۳

(۲۲) ایضاً، ص ۲۹

(۲۳) ایضًا، ص ۴۹۵

(۲۴) محمد اعلیٰ قریشی، مقاماتِ زواریہ، کراچی: ادارۂ مجددیہ، ۱۹۸۲ء، ص ۳۰۰

(۲۵) سیّد زوّار حسین شاہ، مقاماتِ فضلیہ، کراچی: ادارۂ مجددیہ، ۲۰۰۴ء، ص ۶، جدید اشاعت

(۲۶) ایضًا، ص۶

(۲۷) ایضًا، ص۷

(۲۸) ایضًا، ص۷

(۲۹) ایضًا، ص۸

(۳۰) ایضًا، ص۷

(۳۱) ایضًا، ص۱۴

(۳۲) ایضًا، ص۱۰

(۳۳) ایضًا، ص۱۱

(۳۴) ایضًا، ص۵

(۳۵) ایضًا، ص۹

(۳۶) ایضًا، ص۳۶، ۴۲، ۴۸

(۳۷) ایضًا، ص۳۵، ۴۰، ۴۲

(۳۸) ایضًا، ص۳۵

(۳۹) ایضًا، ص۲۸، ۲۹

(۴۰) ایضًا، ص۲۳، ۲۴، ۲۵

(۴۱) ایضًا، ص۵، ۶

(۴۲) سہ ماہی العلم، اپریل تا جون ۱۹۸۱ء بحوالہ تعمیرِ افکار، بیاد زوار حسین شاہؒ، شمارۂ مسلسل ۸۵، جلد ۹، شمارہ ۱۱، ۱۲، دسمبر ۲۰۰۸ء

(۴۳) سیّد زوّار حسین شاہ، انوارِ معصومیہ، کراچی: ادارہ مجدّدیہ، ۱۹۸۰ء، ص ۱۴

(۴۴) ایضًا، ص۱۱

(۴۵) ایضًا، ص۱۱، ۱۲

(۴۶) ایضًا، ص ۱۵

(۴۷) محمد اعلیٰ قریشی، مقاماتِ زواریہ، کراچی: ادارہ مجدّدیہ، ۱۹۸۳ء، ص ۷، اشاعت اوّل

(۴۸) ایضًا، ص۸

(۴۹) ایضًا، ص۹

(۵۰) ایضًا، ص۱۸

(۵۱) آر۔بی مظہری، جہانِ مسعود، کراچی: ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا، ۱۹۸۵ء، ص۵، اشاعت اوّل

(۵۲) ایضاً، ص۷، ۸

(۵۳) ایضًا، ص۴۷، ۴۸

(۵۴) حبیب بخشی، مولانا حبیب الرحمان گبول طاہری، سیرتِ ولی کامل، جلد اوّل، نوشہرو فیروز: ادارۃ المعرفہ، درگاہ اللہ آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۳۳، اشاعت دوم

(۵۵) ایضًا، ص ۱۷

(۵۶) ایضاً، سیرتِ ولی کامل، جلد دوم، دادو: الاصلاح پبلشرز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۰۹، بارِ دوم

(۵۷) ایضًا، ص ۵

(۵۸) ایضًا، ص ۱۱۰

(۵۹) محمد مظہر بقا، حیاتِ بقا اور کچھ یادیں، کراچی: زوّار اکیڈمی پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲

(۶۰) ایضًا، ص ۲۳

(۶۱) ایضًا، ص ۲۵

(۶۲) ایضًا، ص ۲۹

(۶۳) ایضًا، ص ۳۳

(۶۴) ایضًا، ص ۳۵

(۶۵) ایضًا، ص ۶۶

(۶۶) ایضًا

(۶۷) ایضًا، ص ۳۱

(۶۸) ایضًا، ص ۱۸

(۶۹) ایضًا، ص ۱۵، ۱۶

(۷۰) ایضًا، ص ۱۹۳ تا ۱۹۶

(۷۱) ایضًا، ص ۲۵۲

(۷۲) رفیع الدین ہاشمی، اصنافِ ادب، ص ۱۶۶

(۷۳) پروفیسر محمد وکیل احمد، سراج الادب، کراچی: مصطفیٰ ایجوکیشنل سوسائٹی، ۱۹۹۷ء، ص ۷، طبع اوّل

(۷۴) ایضًا، ص ۲۵

(۷۵) ڈاکٹر مسرور احمد زئی، ڈاکٹر غلام مصطفی خاں رحمۃ اللہ علیہ: حالات، علمی و ادبی خدمات، حیدرآباد: ادارۂ انوارِ ادب، ۲۰۰۶ء، ص ۶۲۸، اشاعت اوّل

(۷۶) ایضًا، ص ۶۲۶

(۷۷) پروفیسر محمد وکیل احمد، سراج الادب، ص ۹

(۷۸) ڈاکٹر صاحب زادہ ابوالخیر محمد زبیر، بزمِ جاناں، حیدرآباد: رکن الاسلام پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۹

(۷۹) ایضًا، ص ۱۸

(۸۰) ایضًا، ص ۱۶، ۱۷

(۸۱) ایضًا، ص ۲۲

(۸۲) ایضًا، ص ۶۲

(۸۳) جاوید اقبال مظہری، مجدد اعظمِ برحق، کراچی: مظہری پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۵

(۸۴) ایضًا، ص ۱۴، ۱۵

(۸۵) ایضًا، ص ۱۶

(۸۶) ایضًا، ص ۱۹

ماٰخذ:

(۱) احمد، محمد مسعود، ڈاکٹر پروفیسر، حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری، کراچی: ادارۂ مسعودیہ، ۱۹۹۸ء، طبع ثانی

(۲) بخشی، حبیب، مولانا حبیب الرحمان گبول طاہری، سیرتِ ولی کامل، جلد اوّل، نوشہرو فیروز: ادارۃ المعرفہ، درگاہ اللہ آباد، ۱۹۹۴ء، اشاعت دوم

(۳) _____، _____، جلد دوم، _____، ۲۰۰۳ء، بارِ دوم

(۴) حسنی، یونس، ڈاکٹر، کاوشیں، میرپور خاص: فرہنگ، ۲۰۰۳ء، اشاعت دوم

(۵) رئیس، قمر، ڈاکٹر، انجم، خلیق، ڈاکٹر، اصنافِ ادبِ اردو، علی گڑھ: سرسید بک ڈپو، ۱۹۹۶ء

(۶) زبیر، ابوالخیر محمد، ڈاکٹر صاحب زادہ، بزمِ جاناں، حیدرآباد: رکن الاسلام پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، اشاعت اوّل

(۷) زوّار حسین شاہ، سیّد، حیاتِ سعیدیہ، کراچی: ادارہ مجددیہ، ۱۹۸۷ء، اشاعت دوم

(۸) _____، حضرت مجدد الف ثانی، کراچی: ادارہ مجددیہ، ۱۹۸۳ء، تیسرا ایڈیشن

(۹) _____، مقاماتِ فضلیہ، کراچی: ادارۂ مجددیہ، ۲۰۰۴ء، جدید اشاعت

(۱۰) _____، انوارِ معصومیہ، کراچی: ادارہ مجدّدیہ، ۱۹۸۰ء

(۱۱) زئی، مسرور احمد، ڈاکٹر، ڈاکٹر غلام مصطفی خاںؒ: حالات، علمی و ادبی خدمات، حیدرآباد: ادارۂ انوارِ ادب، ۲۰۰۶ء، اشاعت اوّل

(۱۲) قریشی، محمد اعلیٰ، مقاماتِ زواریہ، کراچی: ادارۂ مجددیہ، ۱۹۸۲ء

(۱۳) مظہر بقا، محمد، حیاتِ بقا اور کچھ یادیں، کراچی: زوّار اکیڈمی پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء

(۱۴) مظہری، آر۔بی، جہانِ مسعود، کراچی: ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا، ۱۹۸۵ء، اشاعت اوّل

(۱۵) مظہری، جاوید اقبال، مجدد اعظم برحق، کراچی: مظہری پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء

(۱۶) وکیل احمد، پروفیسر، محمد، سراج الادب، کراچی: مصطفیٰ ایجوکیشنل سوسائٹی، ۱۹۹۷ء، طبع اوّل

رسائل

(۱) سہ ماہی العلم، اپریل تا جون ۱۹۸۱ء بحوالہ تعمیرِ افکار، بیاد زوار حسین شاہؒ، شمارۂ مسلسل ۸۵، جلد ۹، شمارہ ۱۱، ۱۲، دسمبر ۲۰۰۸ء